ماہنامہ
کراچی
آنکھ مچولی
فروری ۱۹۹۷ء

ڈیجیٹل گھڑی

مفت

خریدار بنایئے

انعام پایئے

آنکھ مچولی مُلک کا مقبول ترین رسالہ ہے۔

اس کے قارئین کی رائے میں یہ ایک بے حد مفید اور معیاری رسالہ بھی ہے۔ ادارہ آنکھ مچولی نے اس رسالے کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے

آنکھ مچولی کے جو ساتھی آنکھ مچولی کے دس سالانہ خریدار بنائیں گے، انھیں ادارے کی جانب سے ایک ڈیجیٹل گھڑی تحفے میں پیش کی جائے گی ___

دس خریدار بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، محلے اور اسکول میں ایسے دس ساتھی آپ ذرا سی کوشش سے تلاش کرسکتے ہیں۔

آگے بڑھیے

سالانہ خریدار بنایئے اور قیمتی انعام پایئے

نوٹ: اس اسکیم میں حصہ لینے کے خواہش مند ساتھی مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھ کر اسکیم کی تفصیلات اور کوپن منگوا سکتے ہیں

ماہنامہ **آنکھ مچولی** ۞ ا۔ پی آئی بی کالونی۔ کراچی ۵ فون ۴۱۱۵۸۷

حبیب بینک کریڈٹ کارڈ اب ایک نئے انداز میں

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ آپ کو نئے اور بہتر کریڈٹ کارڈ سے متعارف کرا رہے ہیں۔

حبیب بینک ملک کا پہلا بینک ہے جس نے ۱۹۶۶ء میں پاکستان میں کریڈٹ کارڈ اسکیم کو متعارف کرایا۔ اور صرف چند ہی سالوں میں یہ اسکیم بے حد مقبول ہوگئی۔ آج حبیب بینک کریڈٹ کارڈ رکھنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور پورے ملک میں ۱۰۰۰ سے زائد ادارے جس میں ایئر لائن، پٹرول پمپ، ہوٹل، ریسٹورنٹ، ہسپتال، ڈیپارٹمنٹل اسٹورز، جنرل مرچنٹس وغیرہ شامل ہیں اسے قبول کرتے ہیں۔

ہمارے کریڈٹ کارڈ رکھنے والے اسے آزادانہ استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ سفر ہو یا خریداری آپ صرف بل پر دستخط کریں۔ باقی کام ہماری ذمہ داری ہے۔

نقد رقوم رکھنا غیر محفوظ ہے، اپنا کریڈٹ کارڈ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ اپنی قریبی شاخ سے رابطہ کر کے نیا کارڈ حاصل کریں۔ موجودہ کارڈز اپنی مدت ختم ہونے تک کارآمد رہیں گے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

مُسلمان کے مُسلمان پر حقوق

نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:

"ایک مُسلمان کے دوسرے مُسلمان پر چھ حقوق ہیں"۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا "جب تم مُسلمان بھائی سے ملو تو اُس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دینے کے لئے مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرو، جب وہ تم سے نیک مشورے کا طالب ہو تو اُس کی خیر خواہی کرو اور نیک مشورہ دو، جب اُس کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اُس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، جب وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت کرو اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔"

(مُسلم)

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷، حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی

۸۷، بلاک نمبر ۷، خانیوال

انوکھے خیال اچھوتی مثال

آنکھ مچولی
کراچی

فروری ۱۹۹۷ء

رمضان المبارک / شوال المکرم ۱۴۱۷ھ

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مُغل
محمد جاوید خالد

امورِ انتظامی
تجمل حسین چشتی
طارق فوزی

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہد محمود

امورِ تشہیر
عبدالرحمٰن خان

سلطان بشیر (اسلام آباد)
فون نمبر: ۲۷۸۷۲۰

شعبۂ تزئین
محمد سلیم اختر (خطاطی)
مومن رحیم (اسکیچز)
دانش اختر (پینٹنگ)

واضح رہے ——— ۱

اِس کتاب میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جا سکتی۔

——— ۲

اِس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث) کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

——— ۳

اِس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچّوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشو و نما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

——— ۴

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے۔

قیمت: ۱۸ روپے ۷ درہم ۷ ریال

زرِ سالانہ

۲۸۰ روپے (مع ڈاک خرچ) پاکستان
۱۰۰ ریال (مع ڈاک خرچ) مشرقِ وسطیٰ
۱۰۰ درہم (مع ڈاک خرچ)

مرزا اسداللہ خان غالبؔ

غالبؔ اردو زبان و ادب کی دنیا بھر میں پہچانی جانے والی عظیم شخصیت ہے۔ ایک نقاد کے بقول: "مغلیہ عہد نے ہندوستان کو تین تحفے دیے۔ اردو زبان، تاج محل اور دیوانِ غالبؔ"

ناشر: ظفر محمود شیخ
طابع: زاہد علی
مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
فون نمبر: 4942857-4948210

خط و کتابت کا پتہ

آنکھ مچولی
گرین گائیڈ اکیڈمی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

بھول کر بھی

کامیابی کو دماغ میں اور
ناکامی کو دل میں جگہ نہ دیجئے

یاد رکھئے

کامیابی دماغ میں جگہ پالے تو تکبّر
اور ناکامی دل میں جگہ پالے تو مایوسی
بڑھ جاتی ہے

مُثبت روّیوں کے ساتھ
مُثبت فِکر کے ساتھ

اپنی شخصیت کی تعمیر کیجئے

دُعاگو آنکھ مچولی

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف	ادارہ	۸
پہلی بات	ڈاکٹر طاہر مسعود	۹
اللہ اکبر (حمد)	ضیغم حمیدی	۱۰
یہی چراغ جلیں گے	محمد جاوید خالد	۱۱
گلو کی بلّی مر گئی (نظم)	محسن علی	۱۸
نیکی کا بدلہ	صوفی تبسم	۲۰
قاری عبدالباسط	خرّم نذر وڑائچ	۲۵
روزہ رکھ لیتے تو ... (نظم)	نفیس فریدی	۲۸
ادھورے خواب	منیر احمد فردوس	۲۹
انوکھی دنیا	ترجمہ: ولی اشرف صبوحی	۳۵
نیا رُوپ	ملیحہ افضل	۳۸
دُنیا کا پہلا اسکاؤٹ	الطاف حسین	۴۳
خلافِ توقع	ابنِ آس	۴۷
کس شان سے پھُوٹے گی سحر (نظم)	بشیر اعجاز	۵۴
لطیفے شطیفے	منتخب لطائف	۵۸
بستے کا نوحہ (نظم)	عباس عالم	۶۲
فارغ البال	شبانہ رشید	۶۳
جھُوٹا	مومن رحیم	۶۶
کرکٹ کے دلچسپ ریکارڈز	سیّد فرحان علی	۷۰
قصر کوئز	محمّد سلیم مُغل	۷۵
خنی اسکواڈ - اغوا	اخلاق احمد	۷۹
نامے میرے نام	قارئین کے خطوط	۹۰
دوسری فتح	ادیبہ ناز	۹۴
مُنّے میاں کی عید (نظم)	محمّد علی انصاری	۱۰۱
پہلی بار	محمّد صابر	۱۰۲
ٹرٹرو میاں	علی حبران	۱۰۵
بھکاری راجہ	ترجمہ: صابر کلوروی	۱۰۷
وطن ہے تمہارا، وطن ہے ہمارا (نظم)	خوش بخت صوفیہ رضوی	۱۱۰
بدقسمت ریاست	امجد فرید	۱۱۱
چھٹتے بادل	حیدون ادیب	۱۱۵
قلم دوست	نو آموز قلمکار	۱۱۹
اقرا	خالد بن محمود احمد	۱۳۰

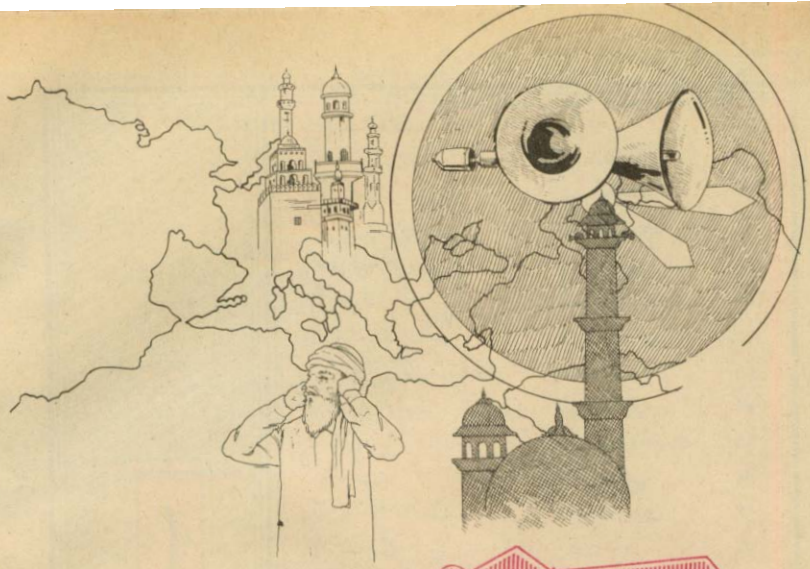

سنہرے حروف

بچپن میں شیخ سعدی شیرازیؒ اپنے باپ کی انگلی پکڑے کسی میلے میں جا رہے تھے۔ راستے میں کسی جگہ بندر کا کھیل دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ باپ کی انگلی چھوٹ گئی۔ باپ تو اپنے دوستوں کے ساتھ آگے نکل گئے اور سعدیؒ تماشا دیکھتے رہے۔ جب تماشا ختم ہوا تو باپ کو سامنے نہ پاکر بے اختیار رونے لگے۔ آخر اللہ اللہ کر کے باپ بھی ڈھونڈتے ہوئے آ نکلے۔ سعدیؒ کو روتے ہوئے دیکھ کر ان کے سر پر ہلکی سی چپت ماری اور کہا۔

"نادان بچے! وہ بے وقوف لوگ جو بزرگوں کا دامن چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح روتے ہیں۔"

سعدیؒ فرماتے ہیں کہ "جب میں نے غور کیا تو دنیا کو ایسا ہی پایا، ایک میلے کی طرح۔ آدمی اس میلے میں مجھ جیسے نادان بچے کی مانند ان بزرگوں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے جو اچھے اخلاق سکھاتے ہیں اور دین کی باتیں بتاتے ہیں۔ لیکن جب زندگی غفلت میں گزار دیتا ہے تو پھر اسے خیال آتا ہے کہ یہ اس نے کیا کیا؟ پھر وہ روتا ہے، پچھتاتا ہے لیکن پھر یہ رونا دھونا اس کے کسی کام نہیں آتا....."

پہلی بات

ڈاکٹر طاہر مسعود

دو آدمیوں کی مثالوں پر غور کیجئے

ایک آدمی بھوکا ہے۔کیونکہ اسے کھانے کے لئے روٹی نہیں ملی ہے۔ اس کے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ وہ ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اور ایک وقت کی روٹی کی بھیک مانگتا ہے۔ جوں ہی اسے روٹی ملے گی وہ اس پر جھپٹے گا اور اسے چٹ کر جائے گا۔ ایک دوسرا آدمی ہے۔ وہ بھی بھوکا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس پیسے بھی ہیں اور کھانے کے لئے روٹیاں بھی۔ لیکن وہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے۔ بھوک اسے بھی ستاتی ہے اور پیاس سے وہ بھی بے حال ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ تکلیف اس لئے اٹھاتا ہے کہ وہ جس مالک کا غلام ہے' اس مالک کا حکم یہی ہے۔ اس آدمی کو اپنے مالک سے محبت ہے' وہ اس کے حکم کی اطاعت کرنا چاہتا ہے۔ اس مالک کے اس پر بے شمار احسانات ہیں' اس نے اسے پیدا کیا ہے' وہ اس کی دعائیں سنتا ہے۔ وہ اسے روزی' روٹی دیتا ہے اور اس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ جو اس کا کہا مانے گا وہ اسے موت کے بعد ایک حسین جنت میں داخل کردے گا اور یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔ چنانچہ اتنے بڑے انعام کے لئے اس آدمی نے اپنے آپ کو بھوکا اور پیاسا رکھا ہوا ہے۔

کیا آپ ان دونوں آدمیوں میں کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

ایک آدمی کی بھوک اس کی مجبوری ہے اور دوسرے کی بھوک اس کی اپنی مرضی سے ہے۔ ایک آدمی اپنی بھوک مٹانے کے لئے بے چین ہے اور دوسرا اپنے مالک کی اطاعت کے لئے بے تاب ہے۔ ایک آدمی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جائے تو اسے غنیمت جانے گا' دوسرے آدمی کے سامنے دنیا جہان کی بہترین غذائیں بھی رکھ دی جائیں تو وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

اب ذرا سوچئے کہ اس دوسرے آدمی کا مقام اپنے مالک کی نگاہ میں کتنا بلند ہوگا۔ مالک تو یہی سوچیں گے ناکہ دیکھو یہ بندہ میرے لئے بھوکا اور پیاسا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ میرے لئے روزہ رکھتا ہے اس لئے اس کا اجر میں دوں گا۔" لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ روزہ صرف بھوکے اور پیاسے رہنے کا نام تو نہیں۔ روزے کا تقاضا ہے کہ آدمی جھوٹ نہ بولے' غیبت نہ کرے' چغلی نہ کھائے' لڑنے جھگڑنے سے بچے' بدزبانی سے بچے' کسی کو تکلیف نہ پہنچائے' بے حیائی کی باتوں سے اور برے کاموں سے خود کو بچائے۔ اگر روزہ رکھ کر ٹی وی' وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈر سے ناچ گانے دیکھتے سنتے رہیں تو پھر یہ روزہ اطاعت نہیں' عادت میں شمار ہوگا اور اجر اطاعت پر ہے' عادت پر نہیں ہے۔

کوشش کیجئے کہ اپنی عادت کو اطاعت میں تبدیل کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ اطاعت ہی سے راضی ہوتے ہیں اور ان کی رضامندی میں ہی نجات ہے۔

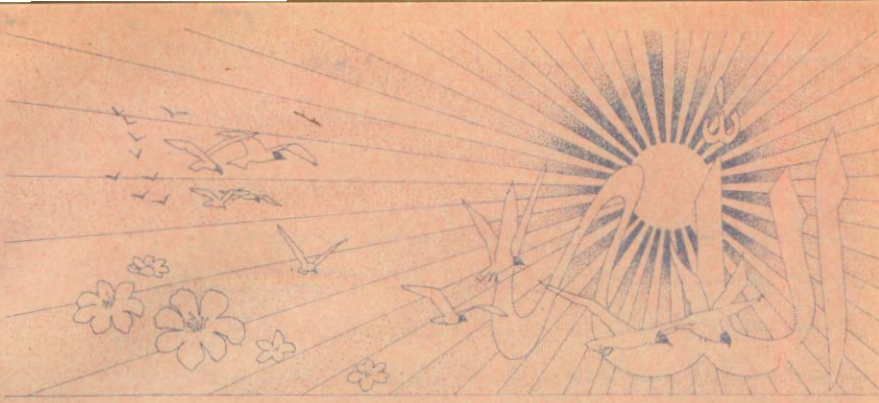

اللہ اکبر، اللہ اکبر

ضیغم حمیدی

تو جان میری، تو ہی مرا دل، اللہ اکبر، اللہ اکبر
اک صرف تو ہے سجدے کے قابل، اللہ اکبر، اللہ اکبر

تو نہ بناتا، کچھ بھی نہ ہوتا، یہ دشت و دریا، یہ کوہ و صحرا
قطرہ، سمندر، موجیں کہ ساحل اللہ اکبر اللہ اکبر

تونے سجائے نیلے فلک پر، یہ چاند تارے، رنگیں نظارے
تو جانِ محفل، تو سب کا حاصل، اللہ اکبر، اللہ اکبر

تو منفرد ہے اور تو ہے یکتا، تو سب سے افضل جان تمنا
تو ہی سفر ہے اور تو ہی منزل، اللہ اکبر، اللہ اکبر

ضیغم پہ تیرے، ظالم جہاں نے، وہ ظلم توڑے، میں کیا بتاؤں
تو میرا ہمدم، تو ہی ہے عادل، اللہ اکبر، اللہ اکبر

یہی چراغ جلیں گے

محمد جاوید خالد

دو افراد آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک کے چہرے پر نُور کی معصومیت تھی اور دوسرے کے چہرے پر جُرم کی شرمندگی۔ شرمندہ چہرے والے کی آنکھیں اُٹھتی تھیں اور جُھک جاتی تھیں۔ معصوم چہرے والے کی آنکھوں میں شدت جذبات سے نمی آگئی تھی۔ شرمندہ چہرے والا کوئی قصّہ بیان کررہا تھا اور سامنے والا اسے بہت غور سے سُن رہا تھا۔ مگر یہ کیسا قصہ تھا؟ یہ کون سی کہانی تھی جو سننے والے کو بے چین کیے دے رہی تھی۔ اس معصوم وجود کو اذیت میں مبتلا کررہی تھی جس کے ہاتھ سے اور ہاتھ ہی سے کیا زبان سے بھی کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچی تھی۔ یہاں تک کہ سننے والے کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ رونے لگا۔ آنسوؤں نے اس کی داڑھی کو تر کردیا۔ اب وہ اس قصّہ کو رو رو کے سُن رہا تھا اور سُن سُن کے رو رہا تھا۔

زندگی اندھے کنویں میں : سُنانے والے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "یارسول اللہؐ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے۔ بتوں کو پُوجتے تھے اور اولاد کو مارڈالتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی۔ جب میں اسے بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن میں نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے تیار کردو۔ وہ تیار ہوکر خوشی خوشی میرے ساتھ روانہ ہوئی۔ میں آگے بڑھتا گیا اور وہ میرے پیچھے آتی رہی۔ جب میں ایک کنویں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا تو میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس اندھے کنویں میں پھینک دیا۔ وہ ابا! ابا! کہہ کر چلّاتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔"

رحمت عالمؐ کی بے تابی : رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دردناک واقعہ کو سُن کر آبدیدہ ہوگئے۔ آپؐ اتنا روئے کہ داڑھی مبارک بھی تر ہوگئی۔ دیکھا جائے تو اس مقتول لڑکی سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن سوچا جائے تو اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس ظلم پر وہ معصوم دل کس کس طرح تڑپا ہوگا۔ جس میں ساری دُنیا کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جو ساری انسانیت کے لئے رحمت ہی رحمت تھا۔ جس کی رحمت سے پرندے اور درخت و پودے تک فیض یاب ہوتے تھے۔ اس نے انسان پر اور وہ بھی معصوم بچوں پر اس ظلم عظیم کو کس نظر سے دیکھا ہوگا؟ دل کے تڑپنے کا اندازہ تو بے شک نہیں کیا جاسکتا لیکن اس نظر سے دیکھنے کا پتہ ان کی پیاری اور مبارک تعلیمات سے چلتا ہے۔

بچّے معتبر ہیں : ایام جاہلیت میں اس طرح کے واقعات عام تھے۔ بچوں کو بلا تکلف قتل کردینا اور خاص طور پر لڑکیوں کو زندہ دفن کردینا اس جاہل معاشرے کا ایک لازمی حصہ تھا۔ رحمت عالم نے اپنی مبارک تعلیمات کے ذریعے اس سفاکانہ رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ آپؐ نے معاشرے میں ہر شخص کے اعتبار کو قائم کیا۔ بچے معاشرے کی اساس ہیں۔ اس اساس کے لئے آپؐ نے بنیادی تعلیمات عطا کیں۔ ذلّت و مصیبت سمجھی جانے والی لڑکیوں کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک دوزخ کے عذاب سے بچانے کا سبب بنے گا۔

آپؐ کے ایک فرمان کا یہ بھی مطلب ہے کہ جو دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہوجائیں پھر اچھی جگہ عزّت کے ساتھ ان کی شادی کردے تو اسے قیامت کے دن رسول پاکؐ کی رفاقت میسر آئے گی اور رفاقت کی مثال آپ نے اپنی دو اُنگلیاں اُٹھا کردی۔

آپؐ نے فرمایا جو شخص بچوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔ آپؐ خود بچوں پر حد درجہ شفقت فرماتے۔ ان کے پاس سے گزرتے تو خود ان کو "السّلام علیکم" کہتے۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور انہیں گود میں اُٹھا لیتے۔

رشتہ داری کا سبب بچّے ہیں۔ : آپؐ نے والدین کو حکم دیا کہ بچوں کے بڑے ہونے تک ان کی خبر گیری کریں۔ ان کی ضرورتیں پوری کریں۔ ان کے اخراجات اُٹھائیں۔ بچوں کے سلسلے میں خاص طور پر آپؐ نے معاشرے کو ایک مضبوط نظام دیا۔ ماں کو پابند کیا کہ وہ بچے کو دودھ پلائے اس کی نگہداشت کرے اور یہ انتظام کرنا باپ کے فرائض میں شامل کردیا گیا۔ باپ پر لازم ہے کہ وہ بچے کی ماں کے لئے کھانا اور کپڑا مہیا کرے۔ اس سلسلے کی اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر کسی بچے کی ماں مرجائے یا کسی وجہ سے شوہر سے علیحدہ ہوجائے تو ایسی صورت میں دوسری عورت بھی اسے دودھ پلاسکتی ہے۔ اس دودھ پلانے والی عورت کا درجہ بھی قریب قریب ماں کے برابر قرار دیا گیا۔ گویا بچوں کی نگہداشت اور ان کی بہتر طریقے سے نشو و نما اسلام میں اتنی قابل احترام ہے کہ اس کی وجہ سے رشتہ داری کا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔

بچّوں کی حالت میں انقلاب : آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیمات نے بچوں کے حوالے سے بھی معاشرے میں ایک انقلابی کردار ادا کیا۔ بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا سلوک نجات کا باعث سمجھا جانے لگا۔ اس انقلاب کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کہاں تو بچوں کی وہ حالت تھی جو مضمون کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔ اور پھر یہ عالم دیکھنے میں آیا کہ بچوں سے شفقت و محبت کے اظہار کے لئے لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے لگے بلکہ محبت بھرے انداز میں جھگڑنے بھی لگے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ ادا فرمانے کے بعد مکہ سے روانہ ہونے لگے تو سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یتیم بچی اُمامہ دوڑتی ہوئی آپؐ کی طرف لپکی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اس کو اُٹھالیا اسے پیار کیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ "یہ لو یہ ہمارے چچا کی بیٹی ہے" حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ "یہ بچی مجھے ملنی چاہئے کیونکہ نہ صرف یہ میرے چچا کی بیٹی ہے بلکہ میری بیوی اس کی خالہ بھی ہے۔" اس پر حضرت زید رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور کہا "یارسول اللہؐ حضرت حمزہ میرے بھی بھائی تھے یہ بچی مجھے ملنی چاہئے۔" حضرت

علی پھر بولے "نہیں نہیں .... یہ میری بہن ہے اور سب سے پہلے میری گود میں آئی ہے۔" رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچی کو اس کی خالہ کی گود میں دے دیا اور فرمایا "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔"

محبت سب بچّوں کے لئے : یہ جان کی حرمت' یہ معصوم بچوں کی نگہداشت' یہ پیار و محبت اور شفقت و خدمت کے احکامات صرف ان ہی بچوں کے لئے نہیں جو اپنی اولاد ہوں بلکہ اس کا دائرہ ساری دنیا کے بچوں تک پھیلا دیا گیا۔ ان بچوں میں سب سے مظلوم بچے' یتیم بچے ہوتے ہیں۔ جن کے ماں باپ نہیں ہوتے جو پرورش کی فطری سہولت سے محروم ہوجاتے ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جاہل معاشرے میں تو ان بچوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے بے شمار بچے باپ کی سایہ سے محروم ہوجاتے تھے۔ یہ بچے کئی طرح سے مظلوم تھے۔ ظلم و زیادتی کا شکار یہ بنتے تھے۔ ان کی پرورش کا کوئی معقول انتظام نہ ہوتا تھا۔ ان کو باپ کی شفقت نہ ملتی تھی اور ان کے سر پر ہاتھ رکھنے والے ان کے جوان ہونے کے ڈر سے ان کے مال و دولت کو جلد از جلد ہڑپ کرلیتے تھے۔ رحمت عالمؐ نے ان بے کس بچوں کے سر پر شفقت و محبت کا ہاتھ رکھا۔ قرآن پاک کی تعلیمات میں ان بچوں کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا گیا۔ ان کے اچھے مال کو برے مال سے نہ بدلنے اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھانے کے احکامات دیئے گئے۔ ان کے لئے صدقات و خیرات دینے کی تاکید کی گئی۔ خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنّت میں دو اُنگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے کہ جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہو۔

ظلم و قتل کا ایک اور انداز : بچوں پر ظلم اور بچوں کا قتل یہی نہیں ہے کہ انہیں جان سے مار دیا جائے۔ انہیں اچھی زندگی سے محروم کرنا' انہیں معاشرے کا ذمہ داری شہری نہ بنانا بھی ان پر ظلم ہے' ان کا قتل ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف بھی نظر فرمائی۔ آپؐ نے بچوں کو ایسا ماحول دینے پر زور دیا جس میں ان کی فطری توانائیاں صحیح طور پر پروان چڑھیں اور وہ مستقبل میں معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوں۔ جسمانی نشو نما کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت کرنا اور انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا بھی ماں باپ کی ذمہ داری ہے۔ اولاد کو

نیک و صالح بنانے کی تدابیر اختیار کرنا اور اس کی بہتری کی دعا کرتے رہنا باپ پر فرض ہے۔ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچے کو ادب سکھانا ایک صالح صدقہ سے بہتر ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچے کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دلائے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک ارشاد کے اندر اتنی معنویت ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بچوں ہی کے لئے سات سال کی عمر میں نماز پڑھنے کا حکم دینے کا ارشاد ان کی بہترین تربیت کا راز رکھتا ہے۔ نماز کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس سے سماجی و اخلاقی آداب حاصل ہوتے ہیں۔ دینیات کی تعلیم ملتی ہے۔ اخوت و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ تنظیم اور اوقات کی پابندی کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ توحید کا درس ملتا ہے۔ توحید جس سے شخصیت میں اعتماد اور کردار میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

جنگ کے میدان سے سبق : بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کا اندازہ ایک اور بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام اور کفر کی پہلی لڑائی یعنی "معرکہ بدر" میں جب مسلمانوں نے کافروں پر غلبہ حاصل کرلیا تو ان کے بہت سے لوگ قید بھی کئے گئے۔ یہ قیدی مسلمانوں کے پکے دشمن اور ان کو سخت تکلیفیں پہنچانے والے تھے۔ ہر لحاظ سے واجب القتل تھے۔ لیکن انہیں معاف کردیا گیا اور نادار قیدیوں کی آزادی کا فدیہ کیا تھا؟ یہ کہ دو دو مسلمان بچوں کو علم کے زیور سے آراستہ کردیں۔

مستقبل کی آواز : سچ تو یہ ہے کہ آج اگر ہم اپنے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہیں تو بچوں کو تحفظ دینا پڑے گا۔ مستقبل کی درخشانی ان ہی بچوں کی روشنی سے وابستہ ہے۔ اپنے معاشرے، اپنے گھروں اور اپنے مدرسوں میں اپنے حال کو، اسی طرح سنوارنا پڑے گا جس طرح اللہ نے چاہا اور جس طرح اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا۔ یہی زندگی کا راز ہے اور یہی مستقبل کی آواز ہے۔

بقول شاعر:

؎ یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

●

اقوال علیؓ

— جب تم دوسروں کے ساتھ برائی یا نیکی کرو تو یوں سمجھو اپنے ساتھ کر رہے ہو۔

— تمہیں جہاں صداقت اور خلوص نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ورنہ تنہائی بہترین رفیق ہے۔ مرسلہ ..... غلام نبی، جھنگ

خ خ خبردار... ہو ہو ہوشیار
دل ہلا دینے والا — نیند اُڑا دینے والا
آنکھ مچولی کا خوفناک نمبر
جولائی ۹۷ء میں شائع ہو رہا ہے
ابھی سے تیاری شروع کر دیجیے

کلّو کی بلّی مر گئی

محسن علی

کلو کی بلی مر گئی
گھر بھر کو سونا کر گئی

اب دودھ کس کو بھائے گا
اب کون چوہے کھائے گا
آئے گا کس کو مکر اب!
یوں کون حج کو جائے گا

جیسے کہ وہ اکثر گئی
کلو کی بلی مر گئی

ہنستے ہو کیوں سب؟ مت ہنسو
رونے کی سب کوشش کرو
آئے نہ گر رونا تمہیں
آنکھوں میں مرچیں ڈال لو

بیتاب کتنا کر گئی
کلو کی بلی مر گئی

چوہوں کی نکلیں ٹولیاں
بجنے لگیں سارنگیاں
خوشیاں مناتے پھرتے ہیں
ہاتھوں میں لے کر جھنڈیاں

کم بخت یہ کیا کر گئی
کلو کی بلی مر گئی

جو ڈر جائے وہ بے ہمت
یہ سب کچھ کر نہیں سکتا

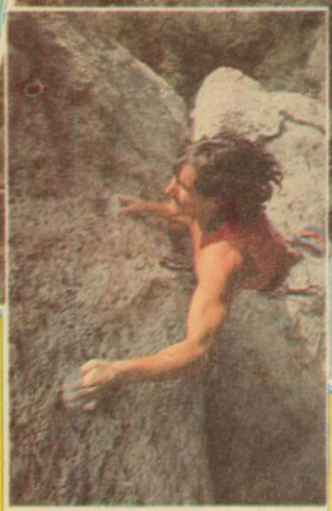

ہمالہ کی بلندی ہو کہ پتھریلی چٹانیں ہوں
مقابل کوئی بھی ہو، تیز ترکش ہو کمانیں ہوں
جو ہمت کا شناور ہو کبھی وہ ڈر نہیں سکتا
جو ڈر جائے وہ بے ہمت یہ سب کچھ کر نہیں سکتا

مومن رحیم

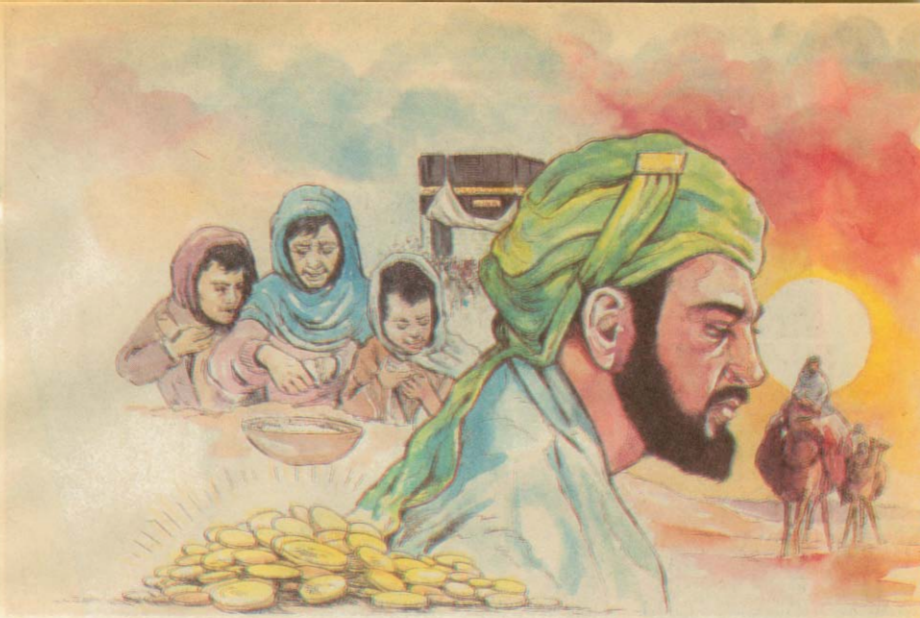

نیکی کا بدلہ

صوفی تبسم

پرانے زمانے کی بات ہے' ایران کی سرزمین میں ایک شہر آباد تھا۔ جس کا نام راوند تھا۔ اس شہر میں ایک سوداگر مہربار نامی رہتا تھا۔ شہر کے لوگ مہربار کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ معاملے کا بہت کھرا آدمی تھا' سچ بولتا تھا اور ہر ایک سے نرمی' پیار اور محبت سے پیش آتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عیدِ قربان نزدیک آرہی تھی اور شہر میں بہت سے لوگ کعبے کو جانے اور حج کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔

مہربار کے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی دولت دی ہے' میرا بھی فرض ہے کہ اس دولت میں سے کچھ روپیہ نکال کر اس نیک کام پر خرچ کروں۔ یہ سوچنے کے بعد وہ گھر آیا اور سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیاری کرنے لگا۔

اس زمانے میں نہ تو ہوائی جہاز تھے، نہ ریل گاڑی تھی، نہ موٹر کار کہ سفر جلدی سے طے ہو جاتا۔ لوگ اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور قافلے بنا کر چلتے تھے۔

راوند کے شہر میں بھی حاجیوں کا ایک قافلہ حج کے لئے تیار ہوا اور مہربار بھی اسی قافلے کے ساتھ مکہ جانے کے لئے روانہ ہوا اور راستے میں اخراجات کے لئے ایک ہزار اشرفیاں کمربند میں ڈال کر اپنی کمر سے باندھ لیں۔

حاجیوں کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ راستے میں تھوڑی دیر کے لئے کہیں رکتا اور پھر آگے روانہ ہو جاتا۔

چلتے چلتے ایک دن قافلہ کوفے کے شہر میں جا پہنچا۔ بڑا شہر تھا، یہاں قافلے والوں نے دو تین دن ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ آرام کر لیں اور گھوم پھر کر شہر کی سیر بھی کر لیں۔

ایک دن تو لوگوں نے آرام کیا۔ دوسرے دن ادھر ادھر گھومنے کے لئے نکلے۔ مہربار بھی سیر کے لئے چل پڑا۔ پہلے تو اس نے شہر کو دیکھا، بازاروں کی رونق دیکھی۔ چونکہ خود سوداگر تھا، لوگوں کو کاروبار میں لین دین کرتے دیکھا اور پھر سوچا کہ ذرا شہر کی فصیل سے باہر نکل کر میدانوں کی بھی سیر کرنی چاہئے۔

مہربار جب شہر سے باہر نکلا تو کچھ فاصلے پر پتھروں اور اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے، جیسے اجڑے ہوئے شہر کے کھنڈر ہوں۔ وہ ادھر کو چل پڑا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھی عورت میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو کرید کرید کر دیکھ رہی ہے، جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں ہو۔

مہربار ایک طرف کھڑا ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کوڑے میں سے ایک مردہ مرغی نکل آئی۔ بڑھیا نے مرغی کو جھاڑا پونچھا اور صاف کرنے کے بعد ایک چادر میں چھپا کر چل پڑی۔

مہربار بہت حیران ہوا کہ یہ بڑھیا اس مردہ مرغی کو کیا کرے گی۔ اسی خیال میں وہ آنکھ بچا کر بڑھیا کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ یہاں تک کہ بڑھیا شہر کے ایک محلے میں پہنچ کر ایک پرانے، خستہ مکان کے سامنے آکر رک گئی اور پھر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازے کا کھلنا تھا کہ

تین چار بچے "امی جان امی جان!! ہمارے لئے کیا لائی ہو؟" کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔ بڑھیا بولی :

"بچو! صبر کرو، تمہارے لئے مرغی لائی ہوں۔ کھاؤ گے تو مزہ آجائے گا۔" یہ کہہ کر بوڑھی عورت نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا، تاکہ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اس کے بچے نہ دیکھ لیں۔

مہربار نے یہ حالت دیکھی، تو اس کا دل ہل گیا۔ اس نے سوچا، ماں کی ممتا بھی کیا چیز ہے! یہ غریب بڑھیا اپنے بھوکے بچوں کے لئے اللہ جانے کیا کیا جتن کرتی ہوگی! یہ سوچ کر مہربار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک طرف ہو کر اس نے ایک ہمسائے سے پوچھا :

"بھائی صاحب! آپ کے ساتھ والے مکان میں جو بوڑھی عورت رہتی ہے یہ کون ہے؟"

ہمسائے نے بتایا :

"یہ بڑھیا بڑی نیک اور پاک باز عورت ہے، بہت غریب ہے بے چاری، لیکن بڑی محنت اور مشقت سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔"

مہربار نے دل میں سوچا، ایسی غریب عورت کی مدد کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ میں حج تو پھر بھی کر سکتا ہوں، اس وقت تو اس عورت کی مدد کرنا زیادہ ضروری ہے۔ لہٰذا جو روپیہ میرے پاس ہے وہ اس بڑھیا کے کام آجائے تو بہتر ہے۔ یہ سوچ کر وہ بڑھیا کے پاس آیا اور تمام اشرفیاں نکال کر بڑھیا کے سامنے رکھ دیں اور کہا :

"بڑی بی! تمہاری یہ امانت کافی عرصے سے میرے پاس پڑی ہے، واپس دینے آیا ہوں۔"

بڑھیا اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور بولی :

"میری کوئی امانت نہیں، بلکہ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں، میں یہ کیسے لے لوں؟"

دونوں میں بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ مہربار اصرار کرتا رہا اور بڑھیا متواتر انکار کرتی رہی۔ آخر مہربار نے تنگ آکر بڑھیا سے کہا :

"بڑی بی! اگر تم یہ ہزار اشرفیاں نہیں لوگی تو میں اس امانت کو اسی کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر جاکر پھینک دوں گا، جہاں سے تم نے وہ مرغی اٹھائی تھی۔ کیونکہ میں اب یہ امانت اپنے پاس نہیں رکھ

سکتا۔"

بڑھیا نے سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور اشرفیاں اٹھالیں اور آہستہ آہستہ سے کہا :

"بیٹا! میں ناچیز اس قابل کہاں ہوں کہ تمہارے اس بڑے احسان کا بدلہ اتار سکوں' اللہ ہی تمہیں اس نیکی کی جزا دے گا۔"

مہربار سرائے میں واپس آگیا' جہاں اس کے دیگر ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے دن جب قافلے نے چلنے کی تیاری شروع کی تو مہربار تنہا شہر کی طرف چلا گیا تاکہ کوئی کام کاج تلاش کرے اور کچھ کما کر گھر کو لوٹ جائے۔

اسے شہر میں کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ آٹھویں دن صبح سویرے وہ سرائے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایک اونٹنی سوار آپہنچا۔ مہربار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا :

"کیوں بھئی نوجوان! کوئی کام وغیرہ کرو گے؟" مہربار بولا : "ضرور کروں گا۔"

اونٹنی سوار نے کہا :

"میں حج کے لئے مکہ جارہا ہوں۔ اکیلا ہوں' چاہتا ہوں میرا کوئی ساتھی ہو اور سفر کے کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ میرے پاس ایک اور اونٹنی بھی ہے' اس پہ تم سوار ہو جاؤ۔"

مہربار کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی تھی وہ فوراً" اونٹنی سوار کے ساتھ ہولیا۔ دونوں نے حج کیا اور حج سے فارغ ہو کر کوفے کو لوٹ آئے۔ اونٹنی سوار نے مہربار کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنا کمربند کھول کر دس ہزار اشرفیاں نکالیں اور اس کی جیب میں ڈال دیں۔ مہربار نے پوچھا :

"یہ کیا ہے؟ میں نے کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں کیا کہ آپ مجھے دس ہزار اشرفیاں معاوضہ دے رہے ہیں۔"

اونٹنی سوار نے کہا :

"یہ تمہاری مزدوری نہیں' بلکہ یہ تمہاری امانت ہے' جو میرے پاس پڑی تھی۔"

مہربار کچھ کہنے ہی کو تھا کہ وہ شخص فوراً" اونٹنی پہ سوار ہوا اور پھر دم بھر میں نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ مہربار کی نیکی کا بدلہ تھا۔

●●

یہ ہے زندگی

مرسلہ : جنید اختر

☆ آدمی کو صرف دو موقعوں پر گھٹنے ٹیکنے چاہئیں چشمے سے پانی پینے اور پھول توڑنے کے لئے۔

☆ ایک لڑکی کا نام ستارے کی چمک اور پھول کی مہک کی طرح ہونا چاہئے لیکن ایک مرد کے نام میں تلواروں کی جھنکار اور کتابوں کی دانائی جھلکنی چاہئے۔

☆ ایک مرغی نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ وہ عقاب ہے۔ وہ ایک چٹان سے جھپٹی اور اس نے اپنے پیر وپر توڑ لئے۔

☆ ایک نہر نے ایک دفعہ سپنا دیکھا کہ وہ ایک طاقتور دریا ہے۔ اس نے ریت پر اپنے پانی کو اچھال دیا اور آن واحد میں خشک ہو گئی۔

☆ یہ مت کہہ مجھے کوئی موضوع دو بلکہ یہ کہہ مجھے آنکھیں دو! (نوجوان ادیب کو نصیحت)

☆ میری کتاب کو قبول کرو۔ کیا؟ کہاں سے؟ کس کی؟ پوچھے بغیر اسے خود بولنے دو۔

☆ حوصلہ یہ کبھی نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے!

☆ حروف بیج ہیں اور نظمیں اناج کے خوشے ہیں۔

☆ جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو وہ سچ ہے، جو تم اپنے کانوں سے سنتے ہو وہ جھوٹ ہے۔

☆ ایک بچے کو بولنے میں دو سال لگتے ہیں، ایک مرد کو اپنی زبان روکنا سیکھنے کے لئے ساٹھ سال لگتے ہیں۔

☆ خیالات اور احساسات دل و دماغ میں ایک مہمان کی طرح بن بلائے اور بلا اطلاع کے نازل ہوتے ہیں، مہمان ہی کی طرح تم نہ ان سے چھپ سکتے ہو نہ بھاگ سکتے ہو۔

☆ ایک درندے کا کچھار ہوتا ہے اور ایک پرندے کا آشیانہ۔ لیکن سورج سب درندوں کے لئے چمکتا ہے اور بارش سب درختوں پر گرتی ہے۔ دھنک ہر آنکھ کے لئے بساط رنگ بچھاتی ہے اور بجلی اونچے پہاڑوں اور گہری کھائیوں دونوں پر چمکتی ہے۔

☆ کسی خیال کو صرف اس وجہ سے غلط مت کہو کہ وہ تمہارا نہیں۔

قاری عبدالباسط

خرم نذر وڑائچ

قاری عبدالباسط دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء کو مصر کے ایک چھوٹے سے شہر قنا میں پیدا ہوئے ان کے والد گرامی حکومت کے ایک محکمے میں ملازم تھے۔ اس کے علاوہ وہ کھیتی باڑی کرکے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ قاری عبدالباسط کے دادا جامعتہ الازہر کے فارغ التحصیل تھے۔ قاری عبدالباسط نے صرف دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔

بچپن میں اکثر ریڈیو پر اس زمانے کے معروف قاری محمد رفعت اور کامل یوسف کی تلاوت سن کر ان کے دل میں بھی قاری بننے کی امنگ پیدا ہوئی۔ چنانچہ اوائل عمری میں قاری عبدالباسط نے تلاوت کرنا شروع کردی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شروع سے ہی مسحور کن آواز، صاف ستھرا گلا اور خوبصورت لہجہ دیا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں قاری عبدالباسط کی قرأت کا یہ

عالم تھا کہ وہ کسی جگہ بھی تلاوت کرتے، راہ گیر رک جاتے، مجمع لگ جاتا اور سننے والے اس ننھے منے قاری کی قرأت سن کر اسے داد دیتے۔ قاری عبدالباسط نے جلد محسوس کرلیا کہ وہ اچھے قاری بن سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے استاد الشیخ محمد سلیم سے سبع قرأت پڑھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ قاری عبدالباسط کی قرأت کے چرچے ہونے لگے اور انہیں مختلف محفلوں میں مدعو کیا جانے لگا۔ مصر میں عام رواج ہے کہ شادی بیاہ یا کسی کے ایصال ثواب کے موقع پر محفل قرأت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ ذوق و شوق کے ساتھ ان محفلوں میں شریک ہونا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے کہ قاری عبدالباسط کو مصر کے شہر قاہرہ کی مشہور مسجد سیدہ زینب میں تلاوت کرنے کا شرف حاصل ہوا، مصر کے نامی گرامی اور معروف قراء اس محفل میں مدعو تھے۔ اس وقت قاری عبدالباسط کی عمر ۲۳ برس تھی۔ قاری صاحب کی دلکش آواز نے لوگوں کے دلوں کو گرما دیا۔ انہوں نے عشق و مستی میں ڈوب کر ایسی تلاوت کی کہ سارا مجمع تڑپ اٹھا۔ اور مسجد زینب کے در و دیوار داد و تحسین سے گونج اٹھے۔ تلاوت ختم ہوئی تو یہ قاری مجمع لوٹ چکا تھا۔ قاری عبدالباسط کی خوبصورت قرأت کے بعد کسی اور قاری کی آواز کا جادو نہ چل سکا۔ یہیں سے قاری صاحب کی شہرت کی ابتداء ہوئی اور پورے مصر میں ان کے نام کی دھوم مچ گئی۔

سن ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ ریڈیو قاہرہ پر قاری عبدالباسط کو تلاوت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس زمانے میں ریڈیو کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ قاری صاحب کی زندگی کے خوشگوار ترین لمحات تھے۔ وہ محسوس کررہے تھے کہ آج سارا عرب ان کی آواز سے لطف اندوز ہورہا ہے۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو شکر کے آنسو ان کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

۱۹۵۱ء میں ہی قاری صاحب کو سعودی عرب کے دورے کی دعوت ملی۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا غیر ملکی دورہ تھا۔ قاری صاحب کو سعودی ریڈیو پر تلاوت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ حرمین شریفین میں بھی تلاوت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ قاری صاحب کہا کرتے تھے کہ انہیں حرمین شریفین اور مسجد اقصیٰ میں کی گئی تلاوت کا لطف اور کیف پھر کہیں نصیب نہیں ہوا۔ سعودی عرب کے دورے ہی سے قاری عبدالباسط عالم اسلام میں متعارف

ہوئے۔ اور ان کی آواز دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں تک پہنچی۔ سعودی عرب کے دورے کے بعد قاری صاحب کو دوسرے اسلامی ملکوں سے دعوت نامے ملنے شروع ہوگئے۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں قاری عبدالباسط نے شام کا دورہ کیا۔ اس دوران ریڈیو سے ان کی تلاوت نشر ہوئی تو سارے ملک میں ان کی قرآت کی دھوم مچ گئی۔

۱۹۵۵ء میں برما جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں بھی بے شمار غیر مسلم ان کی پرسوز تلاوت سن کر مسلمان ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں جنوبی افریقہ کا دورہ قاری صاحب کی زندگی کا خوشگوار اور یادگار دورہ ثابت ہوا۔ یہاں کے عوام نے اسلام کے اس عظیم فرزند کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کردیئے اور والہانہ عقیدت کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا جو قاری صاحب کے دل پر نقش ہوگیا۔ افریقہ کے صحراؤں کی فضائیں قاری عبدالباسط کی پرسوز تلاوت سے گونج اٹھیں۔ ہر محفل میں لاکھوں انسان ان کی تلاوت سننے کے لئے امڈ آتے اور تلاوت ختم ہونے پر ہاتھ چومنے کے لئے دیوانہ وار قاری عبدالباسط کی طرف لپکتے۔

۱۹۸۴ء میں وطن عزیز (پاکستان) میں ان کی زندگی کا آخری دورہ تھا اس دورے میں قاری عبدالباسط نے لاہور، کراچی، ملتان، فیصل آباد، پشاور، سرگودھا، اسلام آباد کے علاوہ دیگر شہروں میں اپنے فن قرآت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستانیوں کے دلوں کو گرما دیا۔ امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ میری زندگی کی دو خواہشیں ہیں ایک حرمین شریفین کی زیارت کروں اور دوسری قاری عبدالباسط کو سامنے بٹھا کر تلاوت سنوں۔ شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ ریڈیو پر قاری صاحب کی قرآت سنی تو فرمایا ''اللہ نے اس قاری کے سینے میں پھیپھڑے نہیں مشکیزے نصب کر رکھے ہیں۔'' اسی دورے میں ۲۳ مارچ کی شب قاری صاحب نے بادشاہی مسجد میں یادگار قرآت کا مظاہرہ کیا۔ اس محفل میں سینکڑوں لوگوں کو سسکیاں بھرتے اور پرنم ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔

قاری صاحب دنیائے اسلام کے عظیم قاری تھے انہوں نے تقریباً نصف صدی عالم اسلام کو قرآن مجید سنایا قرآت کی دنیا میں قاری عبدالباسط کا نام رہتی دنیا تک جگمگاتا رہے گا۔ کتنی عظیم ہے اللہ کی آخری کتاب جو رہتی دنیا تک باقی رہے گی اور کتنے مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اسے پڑھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل ہوگی۔

روزہ رکھ لیتے تو ہوتے نہ گنہگاروں میں

نفیس فریدی

چائے ملتی ہے نہ سگریٹ، کہیں ان کو پیارے
پان و پانی کے لئے پھرتے ہیں مارے مارے
بھوک کے مارے نظر آتے ہیں دن میں تارے
منہ بسورے ہوئے پھرتے ہیں یہ بازاروں میں
روزہ رکھ لیتے تو ہوتے نہ گناہ گاروں میں

کچھ میسر نہیں کھانے کو، ہیں گھبرائے ہوئے
جو بھی بے روزہ ہیں جھینپے ہوئے شرمائے ہوئے
ماہ رمضان میں یہ خود سے ہیں اکتائے ہوئے
کوئی ہوٹل ہے نہ دکان ہے گلیاروں میں
روزہ رکھ لیتے تو ہوتے نہ گناہ گاروں میں

کوئی کرتا ہے بہانہ کسی بیماری کا
اس کو سحری کا گلہ ہے اسے افطاری کا
یہ سبب بنتے ہیں لوگوں کی دل آزاری کا
اور دن بھر نظر آتے ہیں خریداروں میں
روزہ رکھ لیتے تو ہوتے نہ گناہ گاروں میں

ادھورے خواب

سیاہی کی چادر نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور عمیر نے جھٹ سے اپنا سامان تھیلے میں ڈالا اور اسٹیشن سے باہر آگیا۔ اس کے بوجھل اور تھکے ماندے قدم ایک پسماندہ بستی کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جو غریبوں کی بستی کہلاتی تھی۔ دھواں دھواں چہرہ اور میلے کچیلے کپڑے اس کی مفلسی اور غربت کی واضح گواہی دے رہے تھے۔ بستی میں مکمل طور پر اندھیرا چھا چکا تھا۔وہ تھکے ہارے قدموں سے اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں جونہی داخل ہوا، اس کے چھوٹے بہن، بھائی گڈو اور منی خوشی سے چیختے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ "بھیا آگئے، بھیا آگئے۔"

"بھیا! ہمارے لئے آپ نئے کپڑے لائے ہیں نا؟" دونوں بچوں نے امید بھری نظروں سے عمیر کو دیکھتے ہوئے بڑے معصوم سے لہجے میں

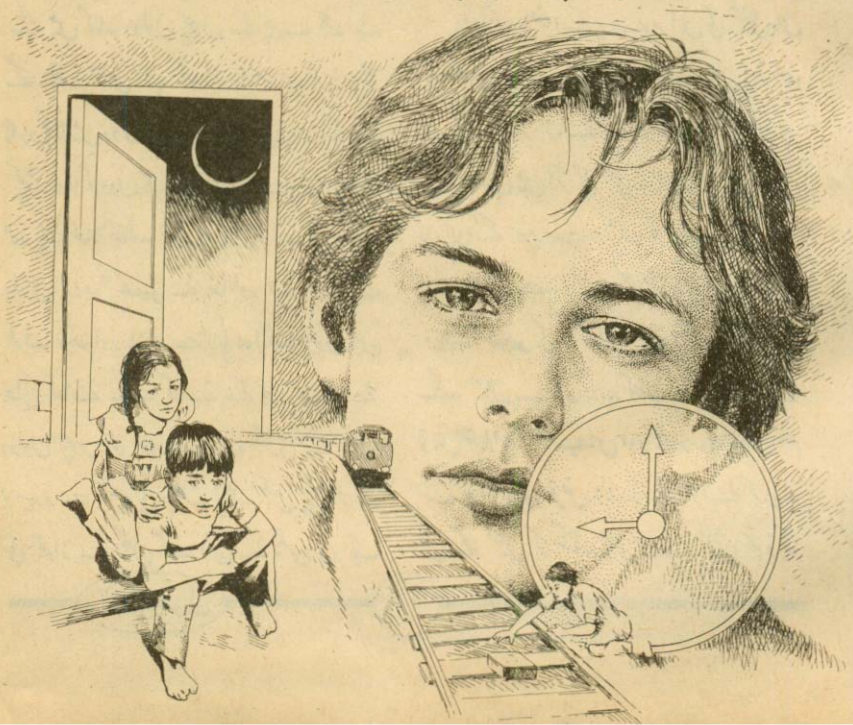

پوچھا۔ عمیر نے ایک مایوس سی نظر اپنے بہن بھائی پر ڈالی، جن کے چہرے جوش اور خوشی سے دمک رہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ وہ جو جواب دے گا اسے سن کر خوشی سے دمکتے یہ چہرے دوسرے ہی لمحے مرجھا جائیں گے لیکن وہ بے بس تھا۔

"بس بچو! تھوڑا سا انتظار اور کرلو۔ ایک دو دنوں تک گڈو اور منی کو نئے کپڑے لادوں گا۔" عمیر نے ناکام سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

"بھیا! یہ تو آپ روز کہتے ہیں آخر کب لے کر دیں گے نئے کپڑے؟ اب تو عید میں بھی صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔" گڈو نے اداس سے لہجے میں کہا۔ دونوں بچوں کے چہرے بجھ سے گئے تھے۔ "بس اب تھوڑا سا صبر اور کرنا ہوگا، پھر دیکھنا میں دونوں بچوں کو اپنی اپنی پسند کے نئے کپڑے لاکر دوں گا۔ اچھا اب سب باتیں چھوڑو اور پہلے کھانا کھالو۔ تم لوگوں کو بھوک لگی ہوگی۔ جلدی کرو۔" عمیر نے کہا اور اپنا تھیلا ایک طرف رکھا اور بازار سے لایا ہوا کھانا تینوں بہن بھائی کھانے لگے۔ کھانے کے بعد عمیر نے دونوں بچوں کو سلادیا۔ پھر وہ لکڑی کے ایک بوسیدہ سے بکس کی جانب لپکا۔ بکس چرچراہٹ کی آواز سے کھل گیا۔ اس نے بکس کی ایک جانب سے کپڑے کی تھیلی نکالی اور چند ایک نوٹ جو اسی تھیلی میں تھے آج کی کمائی شامل کرکے گننے لگا۔ "۱۸۰ روپے" آہستہ سے اس کی آواز نکلی اور زبان گویا کہ گنگ ہوگئی۔ ابھی چالیس روپے کی مزید کمی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹوں کو اسی ترتیب سے رکھ دیا اور واپس آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ عید میں چند روز باقی رہ گئے تھے۔ اس کی معصوم بہن اور ننھے بھائی نے نئے کپڑوں کی فرمائش کی تھی مگر وہ کس قدر مجبور تھا کہ اپنی بہن اور بھائی کی ایک ننھی سی خواہش بھی پوری نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن وہ ان کو مایوس بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اچانک ماضی کے پردے پر اس کی شفیق ماں کی تصویر ابھری۔ وہی ماں جو ایک سال پہلے ان سب کو بے درد زمانے کے حوالے کرکے خود قبر کی وسعتوں میں اتر گئی تھی۔ "بیٹا! میرے بعد تم ہی ان کے سرپرست ہو، ان کا خیال رکھنا تمہارا اولین فرض ہے۔ انہیں کبھی بھی مایوس نہ ہونے دینا۔" عمیر کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ "ماں ..... ماں ..... کہاں ہو تم ماں؟ دیکھو تو ماں، تمہارا بیٹا کتنا بے بس اور مجبور ہے، کیوں ہم سب کو اس خود غرض زمانے کے حوالے کردیا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ کاش ..... کاش تم دیکھ

سکتیں ماں! کہ میں کس قدر بے کس ہوں۔ اپنے ننھے منے بہن بھائی کی ایک چھوٹی سی فرمائش بھی پوری نہیں کر سکتا' جوتے پالش کر کے میں کتنے روپے کما سکتا ہوں یہی دس' بیس روپے جس میں سے تین وقت کا کھانا بھی آتا ہے' ہم سب کو اپنے پاس بلالو یا خود چلی آؤ ماں' آخر کب تک میں اپنے بہن بھائی کو جھوٹی تسلیاں دے کر ان کی خوشیوں سے کھیلتا رہوں گا ماں۔" اور اس کے بعد اس کی آواز رُندھ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔

عید کی آمد اس کے دل کو کچوکے لگا رہی تھی اور کمسن بہن بھائی کے سوالیہ چہرے نشتر کی طرح اس کو اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ "بھیا! میرے لئے وہ نیلی شرٹ اور پینٹ لانا نہ بھولنا اور میرے لئے وہ لال فراک۔" صبح ہوتے ہی دونوں ننھے پھولوں نے اپنی اپنی خواہش کا مچلتے ہوئے اظہار کیا۔ "ہاں' ہاں تم دونوں کے لئے ایسے ہی کپڑے لاؤں گا۔"

عمیر نے اداس اور کپکپاتے ہونٹوں سے دونوں کی ڈھارس بندھائی۔ "سچ بھیا! ہم عید کے دن اپنی پسند کے کپڑے پہنیں گے۔" گڈو نے بے یقینی کے سے انداز میں کہا۔ "ہاں ہاں بالکل سچ' کیوں نہیں پہنیں گے آپ اپنی پسند کے کپڑے۔" عمیر کی آواز دب سی گئی اور آنسو اس کی پلکوں پر ایک مرتبہ پھر جگمگا نے لگے۔ دونوں بچوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ خوشی و جوش سے دمکتے چہرے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ "اور اگر میں ان بچوں کی خوشیاں انہیں خرید کر نہ دے سکا تو؟" عمیر نے سوچا اور اس کے چہرے پر سیاہ غم کے بادل چھا گئے۔

دو سال پہلے اس کا باپ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ تب سے اس کے گھر پر تاریکی نے ڈیرہ جمالیا تھا۔ پھر اس کی ماں بھی بیماری کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور پھر دو کمسن بہن بھائیوں کے ساتھ وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔

عمیر کے پاس ۴۰ روپے کی کمی تھی اور عید میں اب صرف ۴ دن رہ گئے تھے۔ کام کے دوران بھی وہ سوچوں میں الجھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر کام میں لگ جاتا' پھر گھبرا کر دعا کرنے لگتا۔

آج کا دن عمیر کے لئے بہت لکی ثابت ہوا تھا۔ دوپہر تک اس نے ۵۰ روپے کما لیے تھے۔ ایک صاحب نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے بہت سارے پیسے دے دیئے تھے۔ عمیر نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن صاحب کے

کافی اصرار پر اس نے لے لئے۔ اب اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا کیوں کہ اسے جتنے پیسے درکار تھے وہ اس کے پاس آچکے تھے۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے ننھے بہن بھائی کو دیکھ رہا تھا جو اپنی پسند کے کپڑے پہنے خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ **عمیر** بہت زیادہ خوش نظر آرہا تھا کیونکہ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ننھے بھائی اور بہن کی فرمائش پر پورا اترنے والا تھا۔ اس نے خوشی خوشی تھیلا سمیٹا اور گھر کو چل دیا۔ آج اس کے قدموں میں جان تھی۔ پہلے وہ ہارے ہوئے جواریوں کی طرح گھر واپس لوٹتا تھا لیکن آج اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت بڑا معرکہ سر کرکے جارہا ہو۔ وہ جلد ہی اپنے گھر پہنچ گیا اور گھر میں موجود پہلے والے روپے اٹھائے اور گڈو اور منی کو خوشخبری سنائی کہ ابھی تھوڑی ہی دیر میں تمہاری خواہشیں پوری ہونے والی ہیں۔ **عمیر** کا یہی کہنا تھا کہ جیسے ننھے پھولوں پر سارے جہان کی تازگی سمٹ آئی ہو۔ "سچ بھیا! ابھی میری نیلی شرٹ آجائے گی اور میرا سرخ چمکدار جوڑا بھی بھیا؟" دونوں بچوں نے یقین نہ کرنے والے انداز سے پوچھا۔ لہجوں میں بلا کی معصومیت تھی "ہاں، ہاں ابھی تھوڑی ہی دیر میں۔" **عمیر** نے دونوں کو پیار کرتے ہوئے کہا اور اپنے بہن بھائی کی خواہش کی تکمیل کے لئے خوشی خوشی گھر سے نکل کر شہر جانے کے لئے بس میں بیٹھ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے دو معصوم چہرے گردش کرتے رہے اور وہ تصور کی آنکھ سے ان کو کپڑے پہنے دیکھتا رہا۔ بس اپنے اسٹاپ پر جاکر رک گئی۔ شہر کی رنگینیاں عروج پر تھیں۔ بازار میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی تھیں۔ خوبصورت لباسوں میں ملبوس لوگ عید کے لئے خریداری میں مصروف تھے۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور پھر وہ ایک دکان پر جاکر رک گیا۔ سامنے ہی دکان پر بچوں کے زرق برق ملبوسات دمک رہے تھے۔ لال رنگ کی چمکدار فراک اور نیلی شرٹ، پینٹ ہینگر پر لٹکی ہوا کے دوش پر جھوم رہی تھیں۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے بڑھ کر دام پوچھے اور جھٹ سے ان کو پیک کرنے کا آرڈر دے دیا۔ رنگین کپڑے پیک ہورہے تھے اس نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی تو ایک دو جگہ پیوند لگے نظر آئے لیکن اس کی نظروں میں بہن بھائی کے مسکراتے چہرے گھوم گئے۔

"یہ لیں جناب۔" دکاندار نے پیکٹ **عمیر** کو دیتے ہوئے کہا۔ **عمیر** نے پیکٹ کو لے کر بغل میں دبایا اور جیب سے پیسے نکال کر دوکاندار کو ادا

کئے اور دوکان سے باہر آگیا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ پر لگا کر پلک جھپکتے ہی گھر پہنچ جائے اور دونوں بچوں کو حیران کردے لیکن بس اپنی مخصوص دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ خدا خدا کر کے بس اپنے اسٹاپ پر پہنچی۔ عمیر جھٹ سے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا بستی کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک ریل کی پٹڑی کو جو اس کے گاؤں کے راستے میں ہی پڑتی تھی کراس کرتے ہوئے عمیر ٹھٹھک کر رک گیا اس کی نظر ایک عجیب ساخت کے چپٹے لیکن چھوٹے سے ڈبے پر جا پڑی تھی جو پٹڑی کے ساتھ ہی اُگی ہوئی لمبی لمبی گھاس کے درمیان میں پڑا تھا۔ جس پر ایک گھڑی بھی فٹ تھی۔

عمیر بڑی حیرت بھری نظروں سے اس عجیب و غریب چیز کو دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس میں سے ٹک ٹک کی آواز بھی آرہی تھی۔ عمیر چند لمحے تو اس چیز کو دیکھتا رہا اور پھر وہ اس کے اور بھی نزدیک ہوگیا اور اسے جھک کر اٹھانے ہی لگا تھا کہ اچانک فائرنگ کی آواز سے فضا چنگھاڑ اٹھی اور دوسرے ہی لمحے عمیر کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان گنت لوہے کی گرم گرم سلاخیں بیک وقت اس کے پیٹ میں اتار دی ہوں۔ پہلے تو عمیر لمحہ بھر کے لئے لڑکھڑایا اور پھر اوندھے منہ نیچے گر گیا خون اس کے پیٹ سے کسی فوارے کی مانند اچھل اچھل کر آس پاس کی زمین کو سرخ کرتا گیا اور عمیر ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سب کچھ سمجھ گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ آئے روز ملک میں تخریب کاری کی وارداتیں معمول پر تھیں اور یہ سب بھی ایسی ہی وارداتوں کی ایک کڑی تھی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر بعد یہاں سے ٹرین گزرنے والی تھی۔ جس پر سوار لوگ عید منانے کی غرض سے اپنے اپنے گھروں کو رواں دواں ہوں گے اور یہ چپٹا سا ڈبہ یقیناً "بم ہی تھا جو ٹرین کو اڑانے کی خاطر رکھا گیا تھا۔

اور پھر دور کہیں عمیر کو ٹرین کی سیٹی کی آواز سنائی دی جو کہ ٹرین کی آمد کا سگنل تھا لیکن عمیر شدید درد سے نڈھال تھا۔ درد اتنا شدید تھا کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم سے کھال ادھیڑی جارہی ہو لیکن اتنے شدید درد کے باوجود بھی جلد ہی اس نے اپنے بکھرے حواس کو مجتمع کیا اور اپنے کردار کے بارے میں سوچنے لگا جو اسے ابھی یہاں انجام دینا تھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ وہ اپنا کام کہاں سے شروع کرے۔ ٹرین لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی۔ عمیر خود لڑھکتا ہوا پٹڑی کے ایک طرف آگرا

تھا جبکہ بم دوسری طرف تھا۔ درد سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے اچانک عمیر کی نظر پٹڑی کے دوسری طرف کھڑے پانی پر جا پڑی جو کل کی شدید بارش سے جمع ہو گیا تھا اور پھر اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے کوندا۔ اس نے درد کو نظرانداز کرکے اپنی تمام تر طاقت کو جمع کیا اور اپنے آپ کو بم کی طرف گھسٹنے لگا گولیاں لگنے سے پیدا ہونے والا درد اس کے لئے زبردست مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ ایک انچ بھی آگے بڑھنا اس کے لئے محال تھا لیکن اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور بڑی جدوجہد کے بعد اپنے آپ کو پٹڑی کے اوپر لے آنے میں کامیاب ہو گیا لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی ٹرین کی آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھی۔

اور پھر ٹرین کی تیز سیٹیوں سے فضا گونج اٹھی یقیناً" انجن ماسٹر نے پٹڑی پر پڑے عمیر کو دیکھ لیا تھا' لیکن عمیر ہر چیز سے بے نیاز اپنی جان لیوا اور انتھک کوشش میں مصروف رہا بار بار کمزوری کے باعث اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور اس کے پیٹ میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب ٹرین کی متواتر سیٹیوں سے فضا بری طرح گونجنے لگی تھی کیونکہ اس کے اور ٹرین کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم رہ گیا تھا عمیر نے ہمت نہ ہاری اور بدستور اپنی کوششیں جاری رکھیں کیونکہ جو کارنامہ وہ انجام دینا چاہتا تھا وہ اسے ہمیشہ کے لئے امر بنا دیتا لہٰذا وہ اپنے کام میں لگا رہا اور بالآخر اس کے ہاتھ بم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اب ٹرین بھی چیختی چنگھاڑتی بالکل ہی سر پر آن پہنچی تھی۔ عمیر نے ایک بار پھر اپنے ڈوبتے ہوئے حواس کو جمع کیا اور بم کو اپنی جگہ سے اچک لیا اور مزید آخری بار تمام تر قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے بم کو ساتھ ہی کھڑے بارش کے پانی میں اچھال دیا جو چھپاک کی آواز سے پانی میں جا گرا اور دوسرے ہی لمحے عمیر کا جسم ڈھیلا پڑتا گیا اور ٹرین بھی اپنی پوری رفتار سے عمیر کے اوپر سے دوڑتی چلی گئی جس پر لوگ ہر چیز سے بے نیاز بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ابھی یہاں کیا کچھ ہو چکا ہے اور نزدیک ہی پھٹے ہوئے پیکٹ سے کھل کر نئے جوڑے ہوا کے دوش پر پھڑپھڑا رہے تھے اور ادھر ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں دو ننھے بچے خوشی اور جوش سے اچھل کود رہے تھے کہ ہمارا بھیا عید کے نئے کپڑے لے کر ابھی آتا ہی ہو گا' بس آتا ہی ہو گا۔

●●●

انوکھی دنیا

ترجمہ: اشرف صبوحی دہلوی

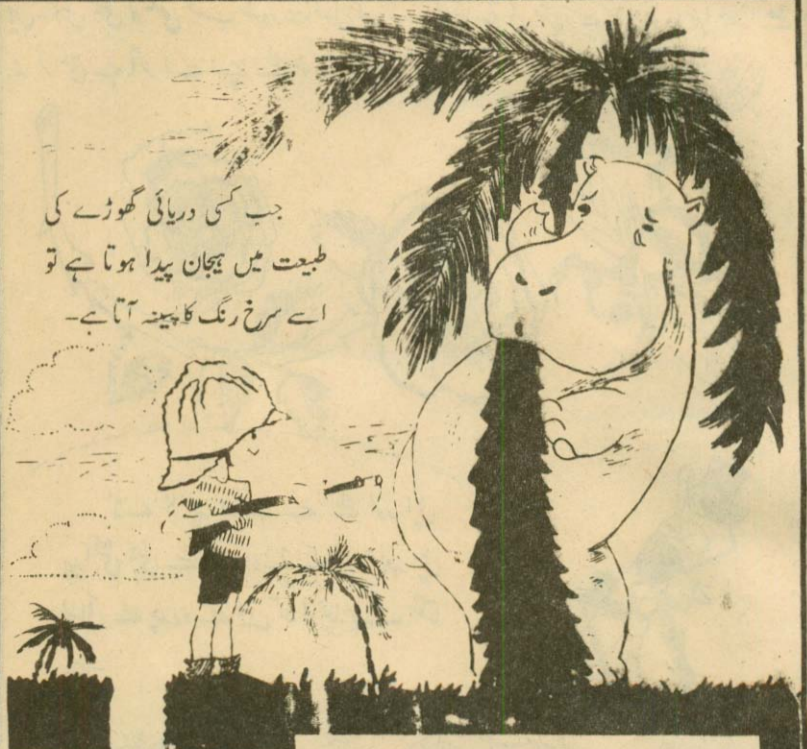

جب کسی دریائی گھوڑے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہوتا ہے تو اسے سرخ رنگ کا پسینہ آتا ہے۔

جب موسم سرما میں گلہری ست پڑی رہتی ہے تو وہ ایک گھنٹے میں بارہ مرتبہ سانس لیتی ہے۔ جاگتے ہوئے وہ عموماً ایک منٹ میں اڑتیس سے چالیس تک اور ہیجان کے عالم میں اس سے بھی زیادہ تیزی سے سانس لیتی ہے۔ انسان کے سانس لینے کی رفتار ایک منٹ میں بیس ہے۔

شہد کی مکھی کے دو معدے ہوتے ہیں جو ایک جھلی کے ذریعے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس جھلی کو مکھی حسب ضرورت کھول اور بند کر سکتی ہے۔ اگر اسے اپنے لئے خوراک کی ضرورت ہوگی تو وہی حصہ کھلے گا جو خاص خوراک کے لئے ہے۔ اور اگر چھتے کے لئے ذخیرہ لے جانے کی ضرورت ہوگی تو دوسرا حصہ کھلے گا۔

ٹڈے کا بچہ انڈے سے نکلنے اور اپنی پیدائشی جھلی سے الگ ہونے کے فوراً بعد اپنی لمبائی سے پندرہ سے بیس گنا اونچا پھدک سکتا ہے۔

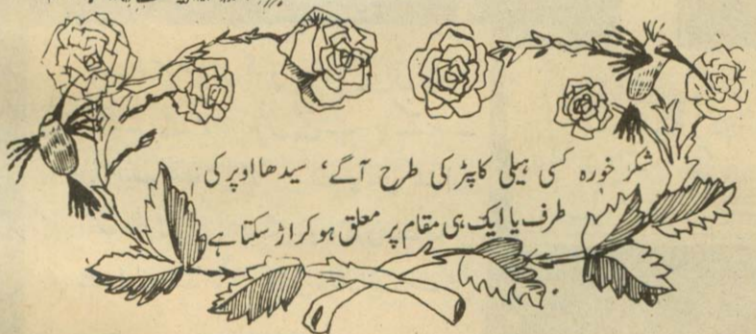

شکر خورہ کسی بیلی کاپڑ کی طرح آگے، سیدھا اوپر کی طرف یا ایک ہی مقام پر معلق ہو کر اڑ سکتا ہے۔

میں چھوٹا سا اک بندر ہوں
پر کام کروں گا بڑے بڑے

بے دوپٹہ لڑکیوں سے
کس قدر بہتر ہوں میں

خوشگوار موڈ

سردی بہت ہے آج
یہ چادر ہی اوڑھ لیں

دھاگہ پرو لوں تو
عید کا جوڑا سیوں

باتیں مت بناؤ
سیدھا ہاتھ ملاؤ

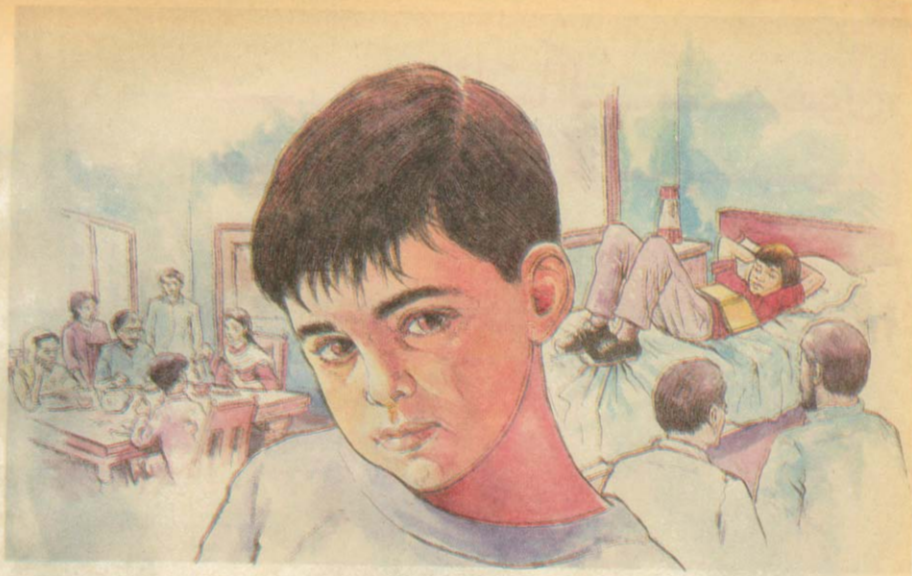

نیا روپ

ملیحہ افضل

دن تو بہت عام سا تھا مگر بات بڑی خاص ہوگئی تھی جس نے سارے گھر کو ایک نئی پریشانی سے دو چار کردیا تھا۔ ویسے تو بقول ابا "جس دن سے منن میاں پیدا ہوئے آفات نے اس گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔" یہ الگ بات ہے کہ ہر آفت کے پیچھے منن میاں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی انہوں نے سارے محلے کو چھ ماہ بعد دوبارہ اپنی سالگرہ پر بلا لیا تھا اور گھر والوں کو خبر تک نہیں تھی۔ مہمانوں کی خاطر کے بعد منن میاں کی اچھی خاصی تواضع ہوئی تھی۔ چنانچہ منن میاں پچھلے ایک ماہ سے بہت شرافت کی زندگی بسر کررہے تھے۔ آپا نے اتنے پرامن حالات دیکھ کر اماں کو کہہ دیا تھا کہ "ہر ماہ چاہے منن میاں کچھ کریں یا نہ کریں ان کی ٹھکائی کردیا کریں تاکہ ہر طرف چین ہی چین ہو۔"

مگر آج صبح ناشتے کی میز پر قیامت صغریٰ ہی تو آگئی۔ دراصل آج صبح منن میاں نے ناشتے کی میز پر ایک مختصر سے خطاب میں حاضرین سے

فرمایا کہ "چونکہ تمام لوگ کہتے ہیں کہ ان کو اچھا بچہ بننا چاہیے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شرارتیں چھوڑ دیں۔ اس ضمن میں کئی ایک عملی اقدامات بھی کئے گئے ۔ مگر جو دھمکی ان کو بارہا دی گئی وہ یہ تھی کہ " اللہ میاں سزا دیں گے۔" سو انہوں نے یہ طے کیا ہے کہ اب وہ بھی اللہ میاں بنیں گے اور بجائے اس کے کہ اللہ میاں سزا دیں اب اللہ میاں جو نیئر یعنی منن میاں سزا دیں گے۔" جس کے ہاتھ نوالہ تھا وہ پلیٹ میں گر گیا اور جن کے منہ میں تھا وہ حلق میں پھنس گیا۔ منن میاں تو اس خطاب کے بعد اڑنچھو ہو گئے مگر حاضرین کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر گئے۔ دادی بے چاری جو سویرے تڑکے ہی ناشتہ کرنے کی عادی تھیں۔ اس وقت استغفار کا ورد کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے تسبیح زمین پر جا گری تھی۔ انہوں نے جھٹ " آیت الکرسی" کا ورد کیا اور سب پر پھونک دیا۔

"اب کیا ہوگا" یہ سوال سب کے ذہنوں میں اٹھا اور امی کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔ البتہ دادا ابا نہایت آرام سے بولے : "اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟ جب محترم اللہ میاں بنیں گے تو ہم بھی فرشتے بن جائیں گے۔ اپنی دنیا ہوگی اپنی جنت اور اپنی دوزخ۔"

"لاحول ولا قوۃ" دادی نے جھٹ سے پھونک دادا ابا پر ماری۔ کیا پتہ مُوا شیطان بیٹھا ہو۔ مگر دادا ابا اپنی جگہ پر جوں کے توں موجود تھے۔ جس پر دادی اماں کو کچھ حوصلہ ہوا۔ " پر دادا ابا آپ اس بات کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیتے؟" بھائی جان نے کہا۔ "بھئی! ہمارے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس نے کونسا اللہ میاں بن جانا ہے۔ ویسے بھی فی الحال دیکھو کہ وہ کرتا کیا ہے اور اسے سمجھاؤ ہو سکتا ہے چند دن میں یہ بخار اتر جائے۔" سب نے ہی اقرار میں سر ہلا دیئے ویسے سب ہی جانتے تھے کہ اگر سمجھانے سے کچھ ہو سکتا تو آج حالات بے حد مختلف ہوتے۔

اصل طوفان تو گھر میں اس وقت اٹھا جب مرتبان توڑنے پر امی نے منن میاں کی پٹائی کرنا چاہی تو وہ بولے " میں آپ کو اللہ میاں بننے کے بعد پوچھوں گا" اور والدہ نہایت پریشان منہ کھولے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

اب تو منن میاں خود کو باقاعدہ اللہ میاں سمجھنے لگے اور کبھی کسی کو جنت اور کبھی کسی کو جہنم میں بھیج رہے ہوتے۔ ایک دن ابو کے کچھ جاننے والے آئے تو ایک انکل نے منن میاں کو پیار کیا اور ٹافی دی تو منن میاں مسکرا کر بولے۔ " ہم آپ کو ضرور جنت میں بھیجیں گے۔" اور وہ

صاحب وہیں پر حیرت کا مجسمہ بن گئے کہ فی الحال جنت یا جہنم دونوں میں سے کسی جگہ ان کے جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

ادھر دن بدن محلے سے بھی شکایات میں اضافہ ہونے لگا" ہر روز کوئی نہ کوئی آجاتا۔ اور ایک دن تو حد ہوگئی کہ مسجد کے مولوی صاحب نے آکر کہا کہ "اپنی اس کافر اولاد کو سمجھالو ورنہ ایسا حشر کریں گے کہ سات نسلیں یاد کریں گی۔" اس واقعہ نے گھر والوں کو بہت فکر مند کردیا مگر دوسری طرف منن میاں تھے جن کو اپنے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔

ایک رات منن میاں میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے کہ یکایک کسی نے انہیں جگایا دیکھا تو سامنے دو نہایت خوفناک آدمی تھے۔ "آپ لوگ کون ہیں؟" منن میاں نے خوفزدہ ہوتے ہوئے پوچھا " ہم اللہ میاں کے فرشتے ہیں۔" دونوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا ایک کے ہاتھ میں رسی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ منن میاں نے سوچا اب جب کہ وہ اللہ میاں جونیئر بن چکے ہیں تو شاید یہ فرشتے اب ان کے انڈر کام کریں گے مگر اتنی خوفناک شکلوں والے آدمیوں کا فرشتے بننا بھی انہیں قطعی منظور نہ تھا۔ سو دل ہی دل میں وہ انہیں مسترد کرتے ہوئے رکھائی سے بولے :

"تو میں کیا کروں؟" "بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں اللہ میاں نے بھیجا ہے کہ اس دنیا میں ایک بچہ ایسا ہے جو اللہ میاں بننا چاہتا ہے اور دوسروں کو تنگ بھی کرتا ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔" اب تو منن میاں کی جان پر بن گئی "تو..... تو ..... پھر..... پھر تم لوگ مجھے واپس چھوڑ جاؤ گے۔" دوسرا فرشتہ خوفناک آواز میں بولا "احمق بھلا آج تک کوئی اللہ میاں کے پاس جاکر کبھی واپس بھی آیا ہے۔"

اب تو منن میاں کی جان پر بن آئی اور وہ رونا شروع ہوگئے۔ "مگر ہمیشہ میرے ساتھ ہی برا کیوں ہوتا ہے؟ نہ کوئی مجھے پیار کرتا ہے اور نہ کوئی میرا خیال رکھتا ہے۔ سب مجھے ہی برا کہتے ہیں اور اللہ میاں بھی مجھ سے ہی ناراض ہیں اسی لئے میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان سب کو ستاؤں۔" دونوں فرشتوں نے بغور اس کی باتیں سنیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

بے وقوف لڑکے اللہ میاں کبھی کسی کو یوں ہی نہیں تکلیف دیتے بلکہ پہلے اس کو موقع دیا جاتا ہے اور جہاں تک یہ بات ہے کہ سب تمہارے ساتھ برا کرتے ہیں؛ یہ بالکل غلط ہے پہلے یہ سوچو کہ تم سب کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ کیا تم نے

بھی کوئی ایسا کام کیا ہے کہ تم سے پیار کیا جائے اور اللہ تو صرف ایک ہی ہے۔ وہ لاشریک ہے' واحد ہے۔ تم بجائے اللہ بننے کے اس کا بندہ بننے کی کوشش کرو' اللہ کا پیار حاصل کرنے کی کوشش کرو' لوگوں کا پیار خود بخود مل جائے گا۔"

یہ بات اتنی مشکل تو نہ تھی اور نہ ہی منن میاں اتنے بے وقوف تھے کہ اتنی چھوٹی سی بات نہ سمجھ سکتے۔ انہوں نے اپنا چھوٹا سا سر ہلایا۔

دونوں خوفناک آدمی چلے گئے اور منن میاں وہیں سجدے میں گر گئے۔

اگلے دن سے لوگوں نے منن میاں کا نیا روپ دیکھا۔ یہ سب کے لئے حیران کن بات تھی لیکن دادا ابا اور بھیا کے لئے نہیں، جنہیں منن میاں کو دوبارہ انسان بنانے کے لئے فرشتوں کا روپ دھارنا پڑا تھا۔

نجومی

خلیفہ ہارون رشید نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ اس کے تمام دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ ہارون رشید کو بہت فکر ہوئی اور صبح ایک تعبیر بتانے والے کو بلایا۔

ہارون رشید نے اپنا خواب بیان کیا تو اس نجومی نے کہا "اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے آپ کے تمام رشتہ دار آپ کے سامنے مر جائیں گے۔" خلیفہ کو بہت رنج و غصہ ہوا۔ حکم دیا اس کو سو کوڑے مارے جائیں۔

اس کے بعد دوسرے نجومی کو بلایا اور خواب سنایا تو دوسرے نجومی نے کہا کہ "امیر المومنین خدا آپ کی عمر دراز کرے آپ کی عمر آپ کے رشتے داروں سے زیادہ ہوگی۔"

یہ سن کر خلیفہ ہارون رشید خوش ہوا اور اس شخص کو خلیفہ نے ۱۰۰ دینار انعام دیئے۔ پھر خلیفہ نے درباریوں سے کہا۔ "دیکھو اس نے بھی وہی بات کہی جو پہلے نے کہی تھی مگر بات ایسے مؤثر لفظوں میں کہی کہ وہ سننے میں بری معلوم نہیں ہوئی۔ پہلے نے ادب کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا اور دوسرے نے اپنا خیال نہایت ہی ادب اور سلیقے سے پیش کیا۔"

منور ارشد' کنری پاک' سندھ

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دائی کی بات سنو

دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

دُنیا کا پہلا اسکاؤٹ

لارڈ بیڈن پاول

الطاف حسین

تاریخ گواہ ہے کہ بنی نوع انسان کو محبت، اخوت، رواداری اور بے لوث خدمت کا مکمل ترین سبق سب سے پہلے ہادی کامل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اور پھر تیرہ سو سال گزر جانے کے بعد اسلام کے انہی زریں اصولوں کو برطانوی فوج کے ایک جنرل لارڈ بیڈن پاول نے "اسکاؤٹنگ" کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آج دنیا میں جہاں بھی یہ تحریک کام کر رہی ہے وہاں اس انسان دوست شخصیت کو سلام پیش کیا جاتا ہے اور ہر سال ان کے یومِ پیدائش کو اسکاؤٹوں کے عالمی دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے اور یہ دن 22 فروری ہے۔ لارڈ بیڈن پاول 22 فروری سنہ 1857ء کو لندن کے ایک قصبہ گلیول میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ابھی بیڈن کی عمر تین سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔

جس کے باعث اس گھرانے کو تنگ دستی نے آن گھیرا۔ سنہ 1870ء میں بیڈن کو لندن کے چارٹر ہاؤس میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں انہیں قابلیت کی بنا پر وظیفہ بھی ملنے لگا۔ زمانہ طالب علمی میں انہوں نے اسکول کی ہر تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کھیل کے میدان میں بھی بہت جلد اپنی صلاحیتیں منوالیں۔ سنہ 1876ء میں آخری امتحان پاس کرنے کے بعد وہ 19 برس کی عمر میں بحیثیت سب لیفٹننٹ برطانوی فوج میں شامل ہوئے اور ہندوستان بھیج دیئے گئے۔ سنہ 1833ء میں کیپٹن کے عہدے پر ترقی حاصل کی اور سنہ 1899ء میں ان کو کرنل بنادیا گیا۔ انہی دنوں جنوبی افریقہ کے حالات بہت زیادہ خراب ہوگئے اور دشمن نے موقع ملتے ہی قصبہ لیف کنگ پر حملہ کردیا۔ آپ نے دو فوجی دستوں کی مدد سے پانچ مربع میل رقبے میں پھیلے ہوئے علاقے کے ساڑھے سات ہزار باشندوں کو 217 دن تک محصور ہونے سے بچائے رکھا۔ اسی دوران سرحدی علاقوں سے 300 آدمی اپنی فوج میں شامل کرلیے اور پھر انہوں نے بچوں کو بھی باقاعدہ تربیت کے بعد اس جنگ میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا۔ قصبہ کے تمام بچوں کو جمع کیا گیا اور انہیں فوجی وردی پہنا کر ڈرل کی تربیت دی گئی۔ نیز انہیں پیغام رسانی، ابتدائی طبی امداد اور دوسروں کی حفاظت کے طریقے بھی سکھائے گئے۔ اس کے بعد ان بچوں کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے میدانِ عمل میں اتار دیا گیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ بیڈن نے ایک سائیکل سوار بچے کو گولیوں کی بوچھاڑ کے درمیان سے باحفاظت نکلتے دیکھا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اسے اپنے قریب بلا کر پوچھا "کیا تمہیں گولیوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں ..... کیونکہ میں اپنی حفاظت کا طریقہ جانتا ہوں۔ میں اس مقام پر پہنچا تو میں نے سائیکل کی رفتار تیز کردی جس کی وجہ سے کوئی گولی مجھے ہٹ نہ کرسکی۔"

بیڈن، جرأت مند بچے کے جواب سے بہت متاثر ہوئے۔ گو کہ سنہ 1900ء میں محاصرہ ختم ہوگیا، لیکن اس حیران کن واقعہ نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ سنہ 1901ء میں انہوں نے ایک کتاب "ایڈز ٹو اسکاؤٹنگ" لکھی، جسے اس کی اہمیت کے پیش نظر برطانوی اسکولوں میں بطور نصاب شامل کرلیا گیا۔ جب بیڈن وطن واپس پہنچے تو بچوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور اسکاؤٹ تنظیم کے قیام کی خواہش ظاہر کی اور بالآخر سنہ 1907ء میں انہوں

نے اسکاؤٹ تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔

انسانیت کی فلاح و بہبود، اتحاد اور امن قائم کرنا اس تحریک کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔ اسی سال انہوں نے رودبار انگلستان کے جزیرے "براؤن سی" میں دنیا کا پہلا اسکاؤٹ کیمپ قائم کیا جس میں 24 بچوں نے شرکت کی۔ اس تجربہ کی کامیابی کے بعد تحریک کا دائرہ کار آہستہ آہستہ وسیع ہونے لگا۔ سنہ 1910ء میں وہ بحیثیت لیفٹیننٹ جنرل فوج سے مستعفی ہوگئے اور تمام تر توجہ اسکاؤٹنگ کی ترقی پر مرکوز کردی۔ سنہ 1910ء ہی میں برصغیر میں بھی اسکاؤٹ تنظیم کی شاخ قائم ہوئی جس کا صوبائی ہیڈکوارٹر والٹن کیمپ (لاہور) میں تھا۔ جبکہ برصغیر ہندوپاک کا پہلا اسکاؤٹ ٹریننگ سینٹر مری (راولپنڈی) کے نزدیک گھوڑا گلی کی پہاڑیوں میں قائم کیا گیا۔ سنہ 1912ء میں بیڈن نے تحریک کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کی غرض سے تمام ممالک کا دورہ کیا۔ سنہ 1920ء میں دنیا بھر کے اسکاؤٹوں کا پہلا عظیم الشان اجتماع لندن میں منعقد ہوا۔ جس میں ان کو ساری دنیا کا "دی چیف آف دی اسکاؤٹ" تسلیم کرلیا گیا۔

سنہ 1937ء میں پاول دن رات کی مسلسل محنت کے باعث بیمار ہوگئے لیکن اس کے باوجود ان کی کوششوں میں کمی نہیں آئی اور تحریک کے فروغ کا سلسلہ جاری رہا!..... بالآخر دنیا کا یہ عظیم محسن 8 جنوری سنہ 1941ء کو اپنی 84 ویں سالگرہ سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ لیکن اپنے پیچھے محبتوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گیا جو آج بھی جاری ہے!!

لارڈ بیڈن نے ایک عالمی اسکاؤٹ جمبوری کے موقع پر اسکاؤٹوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"تم میری طرف سے امن اور دوستی کے نشان بردار ہو!..... تم میں سے ہر ایک میرا سفیر ہے جو میرا پیغام خدمت اور قربانی کے پروں پر اٹھا کر دنیا کے چاروں طرف لے جائے گا۔"

●●

جواہر پارے

○ زمانہ کتابوں سے بہتر استاد ہے۔
(حافظ شیرازیؒ)

○ دل کی آنکھ عبادت سے کھلتی ہے۔
(امام جعفر صادقؒ)

○ غم سے روح میں توانائی آجاتی ہے۔
(خواجہ حسن بصریؒ)

مزید محنت کی ضرورت ہے

۱۔ حمیرا صدیقی (مٹی کا حق۔ لکڑی کا مکان) ۲۔ سراج اکبر (بھروسا) ۳۔ شہناز بانو (انوکھا دوست) ۴۔ محمد یامین (احساس) ۵۔ عظیم اختر (مقابلہ) ۶۔ عبدالغفور سمراء (انگوٹھی کا جن) ۷۔ خالد مہر (انقلاب) ۸۔ محمد علی انصاری (محروم) ۹۔ غلام حسین میمن (آزادی کا سفر) ۱۰۔ عادل خان (اخبار) ۱۱۔ عدیل دانش (عمر خیام) ۱۲۔ خلیل احمد (سچی داستان) ۱۳۔ منظور احمد مگسی (قاتل کون تھا) ۱۴۔ ناجیہ خاتون (غصہ کرنا بری بات ہے) ۱۵۔ حمیرا ناز (بھلائی) ۱۶۔ محمد افضل (مقابلہ جیتنے کے بعد) ۱۷۔ عمر حیات (سنگین وجد) ۱۸۔ ریحان شکیل (بھوت) ۱۹۔ شائستہ زریں (دو مقابلے دو نصیحتیں) ۲۰۔ ساجد نواز پراچہ (شیر اور گھاس) ۲۱۔ محمد فہیم (سائنس کے کھیل' ایک مقابلہ اوٹ پٹانگ سا) ۲۲۔ حسنین عباس (کرکٹ کی دنیا) ۲۳۔ رقیہ آرزو (فیصلہ) ۲۴۔ محمد اکبر رشید (مقابلہ) ۲۵۔ اعجاز احمد فاروقی (چوں چرا کا حاصل) ۲۶۔ نورین مشتاق احمد (شہزادی اور شہزادے کی جیت) ۲۷۔ رابعہ (درود شریف کے فضائل) ۲۸۔ آصف الیاس (شیخ چلی سے ملاقات) ۲۹۔ شائستہ الیاس (غذا کے بارے میں غلط فہمیاں) ۳۰۔ ظہیر اقبال قائم خانی (بلاعنوان کہانی) ۳۱۔ محمد افضل حمید (ہم نے انعام جیتا) ۳۲۔ ارم ابراہیم (حضرت یوسفؑ) ۳۳۔ ماجد خان (گنبد کی شہزادی) ۳۴۔ محمد ریحان (توصیف کا خواب) ۳۵۔ فیاض اختر فیضی (مقابلے) ۳۶۔ نزہت سعدیہ (معصوم دعا) ۳۷۔ محمد ریحان (ہوائی جہاز) ۳۸۔ ناجیہ (نظم کیا کہتے ہیں) ۳۹۔ محمد شکیل لودھی (جھوٹ بولنا بری عادت ہے) ۴۰۔ منور احمد صدیقی (میانداد گرہو کپتان) ۴۱۔ انعام اللہ انعام (چڑیا اور کوا) ۴۲۔ محمد فہیم (نعتؐ) ۴۳۔ احمد فراہ ہاشمی (نظم مجاہد) ۴۴۔ سید کاشف حسین (نظم' میں غریب ہوں) ۴۵۔ ضیا فاطمہ (نظم' بیقراری) ۴۶۔ سراج اکبر آتش (نظم' آنکھ مچولی) ۴۷۔ ناز کشمیری (نظم' مقابلہ) ۴۸۔ یاسر ملک (نظم' کشمیر جنت) ۴۹۔ سلمان خان (کیا کرنا اسکول جاکر) ۵۰۔ حبیب اللہ (نظم' کشمیریوں کی آواز) ۵۱۔ ہاشم علی (نظم' پاکستان) ۵۲۔ علی ناز کشمیری (نظم' انسان بمقابلہ گدھا)

خلافِ توقع

ابنِ آس

شہر کے مشہور وکیل جنید بغدادی کے آفس میں ایک طویل قامت اور بھرے جسم کا مالک شخص داخل ہوا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" جنید بغدادی نے سر اٹھا کر شائستہ انداز میں جواب دیا۔ نووارد وکیل صاحب کے اشارے پر سامنے رکھی کرسی پر مطمئن انداز میں بیٹھ گیا۔

"فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ان کا لہجہ خالصتاً کاروباری تھا۔

"خدمت تو نہیں، البتہ ایک مسئلہ درپیش ہے۔ فی الحال صرف مشورہ درکار ہے، آپ جس طرح مشورہ دیں گے پھر اسی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ضرور، ضرور..... کیوں نہیں..... مشورے دینا تو ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے..... آپ اپنا مسئلہ

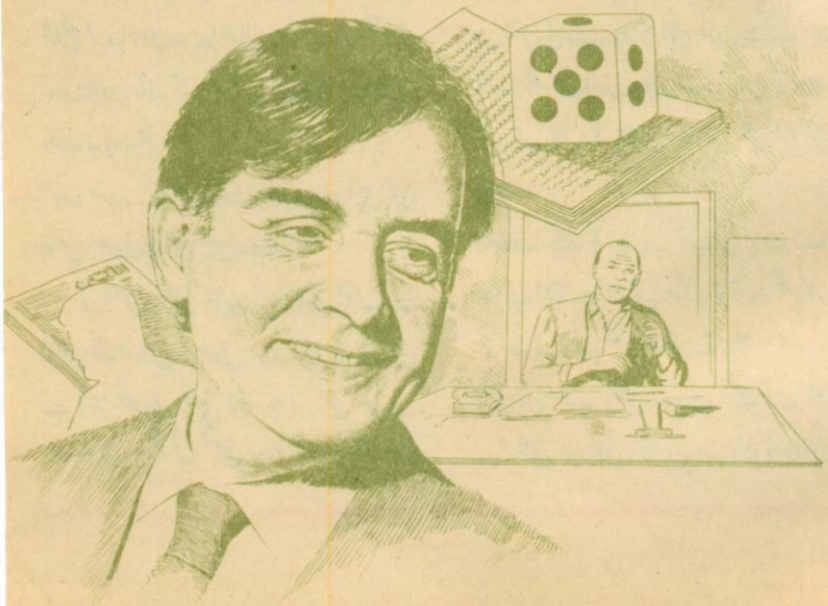

بیان کریں، میں کوشش کروں گا کہ درست مشورہ دے سکوں ..... فیس کا تعین کیس سن کر ہی کر سکوں گا۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

"میرا نام قیوم غوری ہے ..... شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو ..... میں ایک رسالے کا مدیر ہوں ..... بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میں اس رسالے کا مالک ہوں .... اور مدیر بھی....."

"افسوس کہ میں آپ کے نام سے واقف نہیں ..... دراصل رسائل و جرائد سے میرا واسطہ کم ہی پڑتا ہے ..... مصروفیت اس قدر ہوتی ہے کہ بمشکل اخبار ہی پڑھ پاتا ہوں۔" وکیل صاحب کے لہجے میں قدرے شرمندگی کا عنصر تھا۔

"کوئی بات نہیں .... میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ میں تقریباً" دو سال سے یہ رسالہ شائع کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے میں ذرا تفصیل سے بتادوں تاکہ آپ کو مکمل طریقۂ کار سمجھنے میں دقت نہ ہو۔"

"ہاں ضرور .... اس وقت اتفاق سے ایسی کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں ہے۔"

دراصل ہمیں کہانیاں اور ناول ڈاک سے خاصی تعداد میں موصول ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر قلم کار قطعی نوآموز اور غیر معروف ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں لوگوں کو لکھنے کا شوق بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر بہت اچھا لکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں یہ المیہ بھی ساتھ ساتھ ہے کہ ٹیلنٹ کی قدر نہیں ہے، یا یوں کہہ لیں کہ باصلاحیت لوگوں کے لئے مناسب مواقع نہیں فراہم کئے جاتے۔ یہ بدقسمتی تو تقریباً" ہر شعبہ میں ہے۔ ہمارا شروع سے ہی مقصد رہا ہے کہ نئے قلم کاروں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور خدا کے فضل سے ہم اپنی اس کوشش میں بے حد کامیاب بھی رہے ہیں۔ ہمیں ملک بھر سے بے شمار کہانیاں موصول ہوتی ہیں۔ ہم ان کی نوک پلک سنوار کر ان کی باری آنے پر شائع کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ تجارتی تقاضے اور چند دوسری مجبوریاں بھی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنی ضرورت کے مطابق مشہور قلم کاروں سے خود کہہ کر کہانیاں لکھواتے ہیں اور اس کا باقاعدہ معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔

"معاف کیجئے گا ..... آپ کی بات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آپ لوگ نوآموز قلم کاروں کو معاوضہ وغیرہ نہیں ادا کرتے۔"

"جی ہاں، آپ بالکل درست سمجھے ..... ہم کیا ..... شاید ہی کوئی میگزین ہو جو نوآموزوں کو

معاوضہ ارسال کرتا ہو' بلکہ اکثر رسائل والے تو نو آموز کاروں کی تحریریں بھی مشکل سے لگاتے ہیں۔ لیکن ہماری تو پالیسی ہی یہی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔"

"ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟..... آں..... ہاں یاد آیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ مارکیٹ کی ضروریات کے تحت مشہور قلم کاروں سے بھی تحریریں لکھواتے ہیں جو کہ کسی کمرشل میگزین کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اب شروع ہوتا ہے اصل مسئلہ تقریباً" چھ ماہ قبل ہم نے اپنے میگزین میں ایک نئی سلسلہ وار کہانی شروع کرنے کا پروگرام بنایا..... اور ایک مشہور مصنف سے اس سلسلے میں بات کی..... اس نے ابتدائی چند اقساط ہمیں ایک ہفتے میں دے دیں۔ کہانی کافی عمدہ تھی اور سسپنس سے بھرپور تھی..... معاوضے وغیرہ کی بات طے کرنے کے بعد ہم نے اگلے ماہ سے کہانی قسط وار شائع کرنا شروع کردی۔ جب تقریباً" چھ قسطیں شائع ہوگئیں تو ایک روز ڈاک سے ایک خط موصول ہوا..... وہ خط شہر کے ایک مشہور وکیل کی طرف سے تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مشہور مصنف ایسی گھٹیا حرکت بھی کرسکتا ہے۔ میں نے خط دوبارہ پڑھا' آپ بھی اس کے الفاظ سن لیں۔ لکھا تھا۔

جناب ایڈیٹر!

السلام علیکم

آپ کو علم ہونا چاہئے کہ آپ کے رسالے میں گزشتہ چھ ماہ سے شائع ہونے والی قسط وار کہانی نقل شدہ ہے اور اس بات کا مکمل ثبوت میرے پاس ہے۔ جو میرے مؤکل نے مجھے فراہم کیا ہے۔ میرا مؤکل ہی حقیقتاً" اس طبع زاد کہانی کا تخلیق کار ہے۔ جسے آپ کسی اور جعلی نام سے غیر قانونی طور پر شائع کررہے ہیں۔ اس ناول کے جملہ حقوق میرے مؤکل کے نام محفوظ ہیں اور ہم اس حوالے سے ضروری قانونی کاروائی کرنے پر غور کررہے ہیں' اگر اس سلسلے میں آپ ملاقات کرنا چاہیں تو جمعرات کی شام پانچ بجے میرے دفتر میں ملاقات کی جاسکتی ہے' ورنہ بصورت دیگر آپ سے عدالت میں ملاقات ہوگی۔

والسلام

ایڈوکیٹ

ایک لمحے کو میں نے سوچا' شاید یہ کسی نے

سستی شہرت کے حصول کے لئے لکھ مارا ہے۔ مگر پھر قانونی چارہ جوئی کا خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ اگر میں مذکورہ وکیل سے جا کر مل لوں اور ثبوت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں تو حرج ہی کیا ہے۔ کیا خبر یہ بات درست ہو۔ چنانچہ میں جمعرات کو وقت مقررہ پر وکیل کے دفتر پہنچ گیا۔ وکیل نے میرے سامنے ایک بوسیدہ سا ناول رکھ دیا جو پاکستان بننے کے فوراً بعد شائع ہوا تھا۔ میں نے ناول کے بوسیدہ اوراق پر سرسری نظر ڈالی تو واقعی بات درست تھی۔ اس مصنف کے بچے نے اس ناول کو صرف کرداروں کے نام تبدیل کر کے ہمیں دے دیا تھا اور ہم سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کر رہا تھا۔

وکیل نے مجھ سے کہا "میرے مؤکل اس ناول کو دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر آپ کے رسالے کی اس گھٹیا حرکت سے انہیں بہت نقصان پہنچا ہے۔ چنانچہ ہرجانے کے طور پر انہیں تیس ہزار روپے دیئے جائیں ورنہ عدالت میں چلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

یہ سن کر تو حقیقتاً" میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مجھے رہ رہ کر اس مصنف پر غصہ آ رہا تھا۔ جس نے اس قدر نیچ حرکت کی تھی اور مجھے مشکل میں پھنسا دیا تھا۔ میں نے ان سے چند دن کی مہلت مانگی اور واپس آ گیا۔ میں حقیقتاً" مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر میں وکیل کے کہنے کے مطابق ہرجانہ ادا نہ کرتا تو میرے رسالے کی تو بہت بدنامی ہوتی۔ مجھے رہ رہ کر اس مصنف پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر کیا کرتا مجبور تھا۔ وہ ان دنوں شہر سے باہر تھا۔ چنانچہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ بیٹا اب اگلی قسطیں دینے آئے گا تو گُدّی سے پکڑ لوں گا۔ فی الحال تو اس مسئلے سے نپٹنا تھا۔ آخر کار مجبوراً" میں نے مدعی کو تیس ہزار روپے ادا کر دیئے اور اس مصنف کا انتظار کرتا رہا اور پھر پرسوں مذکورہ چور مصنف گردن اکڑائے جب میرے دفتر میں آیا تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ جب میرا غصہ قدرے کم ہوا تو وہ ایک عجیب سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔

"جناب ایڈیٹر! ..... آپ حد سے بڑھ رہے ہیں، آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ میرا نام کتنا بڑا ہے ..... آپ کی ہمت کیسے ہوئی کہ اس قدر پست الزام مجھ پر لگائیں۔ یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ میری کہانی ان کے ناول سے ملتی جلتی ہو اور بس ..... یہ کہانی تو ابھی اور آگے جائے گی .... وہ ناول تو اتنا طویل نہ ہو گا ..... باقی کی کہانیاں کہاں سے آئیں گی ....."

یہ سنتے ہی میرا غصہ دو چند ہو گیا۔ میں نے بھپر کر کہا "مسٹر فضول بکواس مت کرو۔ وہ تیس ہزار تو تمہیں ادا کرنا پڑیں گے۔ تم نے خود کو سمجھا کیا ہے ..... میں تمہارے خلاف مقدمہ کردوں گا....."

وہ ہنسنے لگا اور پھر بولا "بہت مشکل ہے ..... یہ کہانی سو فیصدی میری ہے ..... تمہارے تیس ہزار تو ڈوب گئے ..... کیونکہ تمہاری قسمت خراب ہے اور اب اگر تم نے کورٹ تک جانے کی بے وقوفی کی تو تم سے بڑا بے وقوف کوئی نہ ہوگا۔ الٹا تم اور تمہارا رسالہ بدنام ہوجائے گا۔ تم جتنا بڑا وکیل کرلو.... یہ کیس جیتنا تمہارے نصیب میں نہیں ہوگا۔ کیونکہ میرا وکیل نہایت آسانی سے میری کہانی کو طبع زاد ثابت کردے گا اور تمہارے کیس کی دھجیاں بکھیر دے گا۔ تم اور تمہارا رسالہ کسی قابل نہیں رہے گا۔ سمجھے....."

"وہ یہ دھمکی دے کر چلا گیا اور میں صرف ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔ یہ ہے کُل قصہ وکیل صاحب ..... اور اب میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں نے آپ کی بہت شہرت سنی ہے۔ اس لئے آپ ہی مجھے درست مشورہ دے سکتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ کیا میں یہ کیس جیتنے کی پوزیشن میں ہوں۔ یعنی اس کیس کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا یا اس منصف کے حق میں۔"

وکیل صاحب نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی اور بولے "آپ میرے سوالات کے جواب دیں، سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ وہ شخص جسے آپ نے تیس ہزار روپے دیئے، بمعہ ثبوت کے عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں ..... وہ ناول با آسانی مل سکتا ہے۔"

"کیا آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ وہ ناول آپ کی شائع کردہ قسط وار کہانی کا اصل ہے؟"

"جی ہاں ..... وہ اسی کہانی کا اصل ہے، مگر پانچ قسطوں میں ناول ختم ہوگیا تھا، اب آگے کی کہانی ظاہر ہے مختلف ہے....."

وکیل صاحب مطمئن ہوگئے ..... اور بولے ....."کیا نام بتایا تھا آپ نے اپنا..... ہاں قیوم غوری صاحب ..... مسئلہ کلیئر ہے ..... اس مصنف کی دھمکی بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خواہ کتنا بھی بڑا وکیل کرلے۔ ہوشیار سے ہوشیار اور چالاک سے چالاک وکیل کی خدمات حاصل کرکے بھی وہ اس کیس کو نہیں جیت سکتا....."

"شکر ہے خدا کا .... ورنہ میں تو سمجھا تھا کسی

قانونی باریکی کی بناء پر کہیں یہ کیس مصنف کے حق میں نہ جارہا ہو۔"

"نہیں بے فکر رہیں، ایسی کوئی قانونی باریکی نہیں ہے..... اس میں سو فیصدی آپ کی کامیابی ہے۔ میں اس کیس کو اس قدر مضبوط بنا کر پیش کروں گا کہ آپ کے ہارنے کے ایک فیصدی چانس بھی نہیں ہوں گے، بشرطیکہ آپ وہ ناول میرے سامنے لادیں۔"

"سوچ لیں وکیل صاحب..... میری پہلے ہی رقم ڈوب چکی ہے۔"

"آپ کی ڈوبی رقم بھی واپس مل جائے گی..... آپ فکر مت کریں....."

اچانک قیوم غوری کا لہجہ تبدیل ہوگیا، اس نے انتہائی راز داری سے کہا۔ "وکیل صاحب ..... یہاں تک تو یہ بات سمجھ میں آگئی..... اور اب میرے ذہن میں ایک عجیب سی پلاننگ ہے .... آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ پہلے آپ اچھی طرح سوچ لیں، کوئی ایسا راستہ ہو جس پر چل کر فیصلہ مصنف کے حق میں جاتا ہو۔"

وکیل نے قیوم غوری کے بدلے ہوئے لہجہ پر توجہ نہ دی اور مضبوط لہجے میں کہا۔ "ایسا ناممکن ہے۔ ویسے آپ کی پلاننگ کیا ہے؟"

"پلاننگ میں آپ کو بتاؤں گا تو آپ حیران رہ جائیں گے، پہلے یہ سوچیں کہ یہ فیصلہ مصنف کے حق میں کس طرح جاسکتا ہے؟"

وکیل صاحب الجھ کر رہ گئے۔ قیوم کے ذہن میں نہ جانے کون سا کیڑا کلبلا رہا تھا..... انہوں نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا۔

"بس ایک راستہ ہے کہ وہ ثبوت عدالت نہ پہنچ سکے..... بس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جب آپ ثبوت عدالت میں نہیں پہنچائیں گے تو مقدمہ کس بنیاد پر ہوگا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" قیوم غوری کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اچانک کھڑا ہوگیا۔ "اچھا وکیل صاحب پھر میں چلتا ہوں۔"

"ارے..... ارے کہاں چلے..... کیا اس کیس کو حل نہیں کرائیں گے؟"

"نہیں وکیل صاحب..... میں یہ مقدمہ نہیں لڑوں گا..... میں نے ارادہ تبدیل کردیا ہے آپ بلاشبہ بہت اچھے وکیل ہیں، آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے....."

"کیا مطلب! ارادہ بدل دیا ہے..... مگر کیوں؟..... یہ کیس تو سراسر آپ کے حق میں جارہا ہے..... پھر ارادہ کیوں بدل دیا۔ آپ کو اپنی ڈوبی رقم واپس مل سکتی ہے۔..... اور اس

کے سو فیصد چانس ہیں۔" وکیل صاحب کلائنٹ ہاتھ سے جاتا دیکھ کر گھبرا گئے۔

"بس اسی بناء پر تو ارادہ بدل گیا ہے کہ یہ کیس مصنف کے حق میں بالکل نہیں جا رہا..... میری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی ہے ..... کچھ اور سوچوں گا....."

"حیرت ہے ..... آپ تو انتہائی عجیب بات کر رہے ہیں ..... اور یہ پلاننگ والی بات بھی پلّے نہیں پڑ رہی ہے۔"

"ہاں حیرت کی بات تو ہے ..... مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں اصل میں قیوم غوری نہیں ہوں ..... بلکہ میں تو وہ مصنف ہوں جس کے متعلق آپ کہانی سن رہے تھے ..... آپ خود فیصلہ کریں ..... میں یہ کیس کس طرح لڑ سکتا ہوں ..... جس میں میری کامیابی ایک فیصد بھی متوقع نہیں ہے۔ میں آپ کے مشورے سے کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا چاہ رہا تھا جس پر چل کر قیوم غوری سے نمٹ سکوں.....

بہر طور.....

خدا حافظ....." وہ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

وکیل صاحب کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

●

دل و دماغ کی اضافی قوت
کے لئے مُربّہ سیب چاندی کے
ورق میں لپیٹ کر کھائیے

احمد کا

مُربّہ سیب

انتہائی مقوی

کس شان سے پھوٹے گی سحر

بشیر اعجاز

اے انجمِ شب تاب ادھر دیکھتے رہنا
کس شان سے پھوٹے گی سحر دیکھتے رہنا

محسوس ہوئی ہے مجھے مقتل میں گھٹن سی
خطرے میں ہے قاتل کا بھی سر دیکھتے رہنا

گزرے ہیں جو چاہت میں تری دار و رسن سے
کھولیں گے وہی بابِ ظفر دیکھتے رہنا

اچھلا ہے چٹانوں میں جہاں خونِ شہیداں
پھوٹیں گے وہاں لعل و گہر دیکھتے رہنا

ہم مر کے بھی اس خاک میں ہیں زندۂ جاوید
باندھیں گے عدو رختِ سفر دیکھتے رہنا

اے جنتِ ارضی تری عظمت کی قسم ہم
اجلائیں گے پھر تیرے نگر دیکھتے رہنا

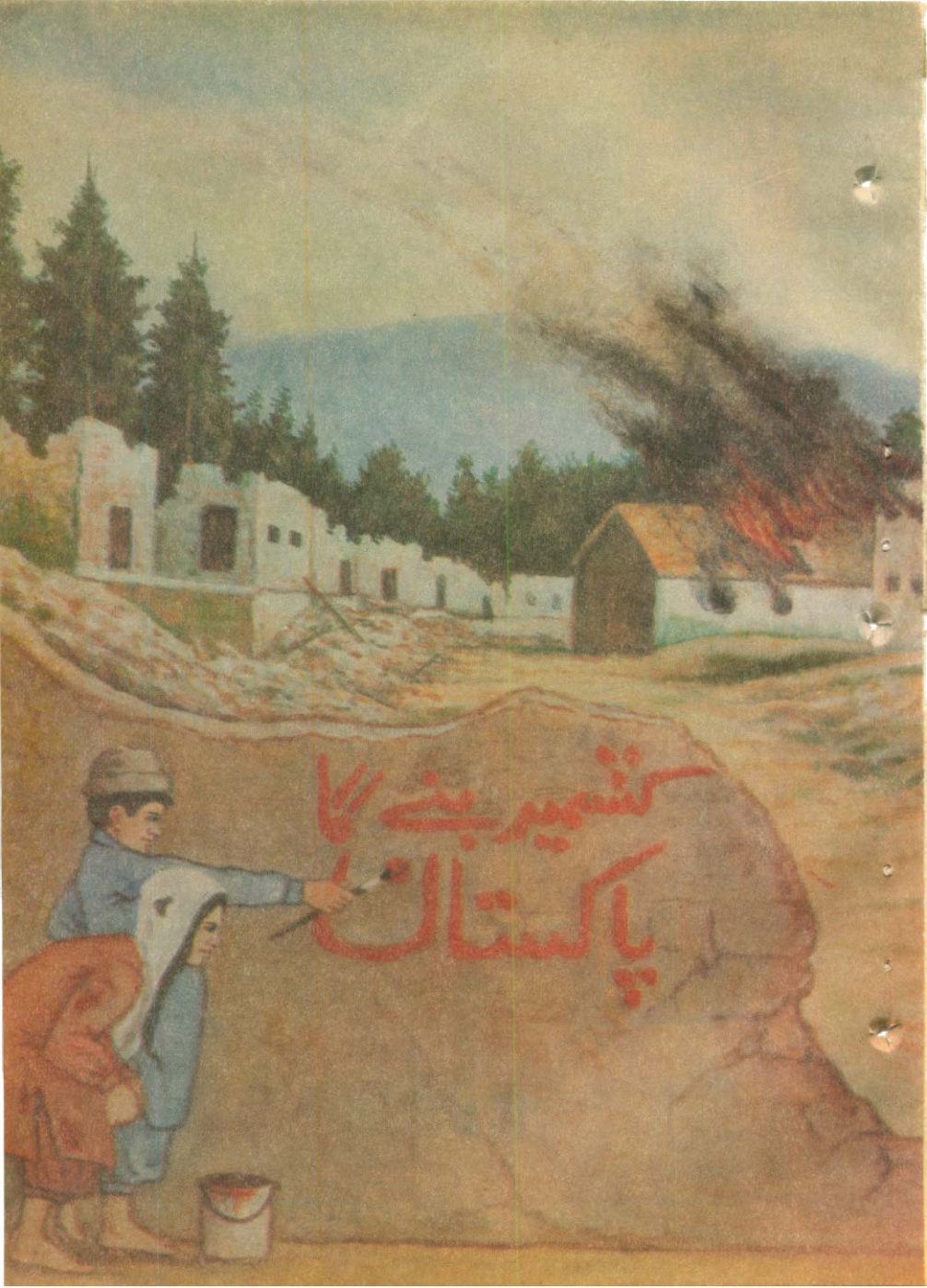
کشمیر بنے گا
پاکستان

جنگ عظیم سے قبل کار ریس
میں حصہ لینے والے دو ماڈل

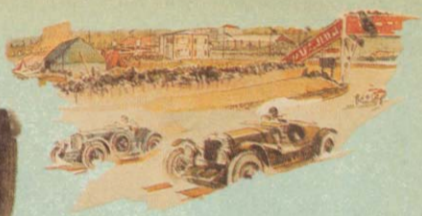

قدیم برطانوی ریسنگ کاریں

لیجیے کار ریس
شروع.....

کار ریسنگ اور ریسنگ کار

ایسی کاریں کہ "پنکھ ہوتے تو اُڑ جاتیں"

برازیل کے "آئرٹون سینا" جنہوں نے ۱۹۹۱ء کے بعد مسلسل ۴ کار ریس جیتیں

آج کی کار ریسنگ کا
ایک انداز

فراری ۳۱۲ - ٹی ۴
۱۹۷۹ء میں عالمی چیمپئن شپ جیتنے والی کار

اُمیمہ

رستوں میں نہ بیٹھو کہ ہوا تنگ کرے گی بچھڑے ہوئے لوگوں کی صدا تنگ کریگی
روانڈا کے دو بچے جن کے والدین ملک میں ہونے والی خانہ جنگی کا نشانہ بن گئے!!

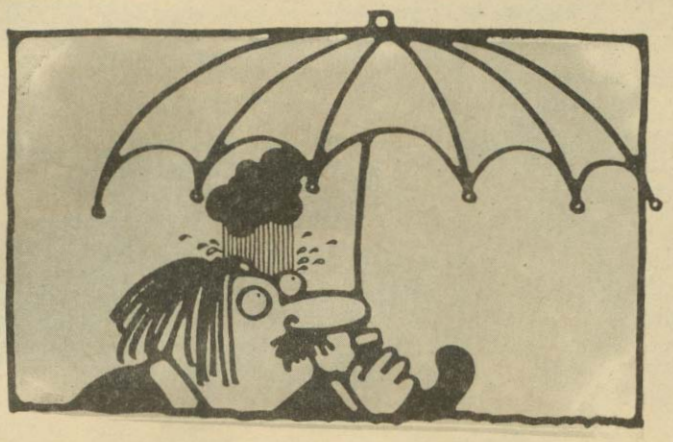

لطیفے شطیفے

ملا نصیرالدین نے سحری کے لئے دودھ میں جلیبیاں بھگو کر رکھیں۔ جب سحری کے لئے اٹھے اور بیوی سے جلیبیاں مانگیں تو بیوی نے کہا کہ وہ تو بلی کھا گئی۔ ملا نصیرالدین بھی چادر تان کر لیٹ گئے اور بولے "اچھا تو بلی سے کہہ دینا کہ آج روزہ بھی وہی رکھ لے۔"

☆ ---☆--- ☆

جنگل میں ایک چوہا تیزی سے ایک طرف دوڑ رہا تھا ایک لومڑی نے اس سے اس قدر بے تحاشہ دوڑنے کی وجہ دریافت کی تو چوہے نے جواب دیا۔

"تم نے سنا نہیں کہ کسی نے ہاتھی کے تھپڑ مار دیا ہے۔"

"ہاں میں نے سنا تو ہے لیکن تم اس قدر ہراساں کیوں ہو رہے ہو؟" لومڑی نے استفسار کیا۔

چوہے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑی راز داری

سے جواب دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ سب جانوروں کو مجھ پر شک ہو گیا ہے۔"

☆ ---☆--- ☆

ایک چھوٹی لڑکی نے جس کا باپ جج تھا پیار سے پوچھا : "ابا جان میری سالگرہ پر آپ مجھے کیا تحفہ دیں گے۔"

باپ جو کسی مقدمے کا فیصلہ لکھنے میں مصروف تھا۔ بولا : "چودہ سال قید بامشقت۔"

☆ ---☆--- ☆

فقیر : "ہے کوئی خدا کا بندہ جو مجھے سینما دکھا دے۔"

راہ گیر : "ارے! تم تو اندھے ہو سینما کیا خاک دیکھو گے۔"

فقیر : "سخی داتا..... گانے ہی سن لوں گا۔"

☆ ---☆--- ☆

استاد شاگرد سے : "مثال سے ثابت کرو کہ گرمی میں چیزیں پھیلتی اور سردی میں سکڑتی ہیں۔"

شاگرد : "جناب! گرمیوں میں چھٹیاں پھیل کر دو ماہ کی ہو جاتی ہیں اور سردی میں سکڑ کر صرف دس دن کی رہ جاتی ہیں۔"

☆ ---☆--- ☆

ایک کنجوس آدمی نے اپنے بچوں سے کہا کہ

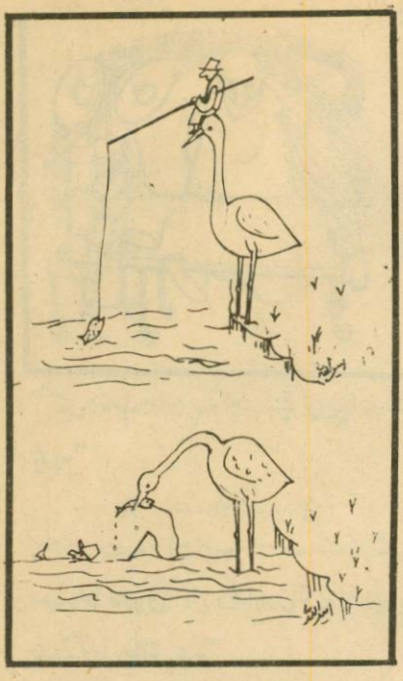

آج رات کا کھانا جو بچہ نہیں کھائے گا اسے ایک روپیہ انعام میں ملے گا۔ سب بچے ایک ایک روپیہ لے کر سو گئے۔ جب صبح کو اٹھے تو کنجوس باپ نے کہا جو ایک روپیہ دے گا ناشتہ اسے ملے گا۔

☆ ---☆--- ☆

ایک سیاح کسی گاؤں میں گیا اور ایک دیہاتی سے پوچھا : "یہاں پر کوئی بڑا آدمی پیدا ہوا ہے؟"

دیہاتی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

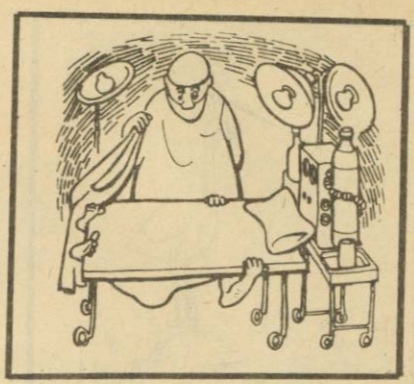

"نہیں جناب یہاں پر تو ہمیشہ بچے ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

☆ ---☆--- ☆

پہلا دوست : (دوسرے دوست سے) "میں جب دادا جان کی تلوار دیکھتا ہوں تو میرا لڑائی پر جانے کو دل چاہتا ہے۔"

دوسرا دوست : "تو پھر جاتے کیوں نہیں؟"

پہلا دوست : "کیا کروں اس کے فوراً بعد ان کی لکڑی کی ٹانگ یاد آجاتی ہے۔"

☆ ---☆--- ☆

ایک بڑھیا زمین پر گر پڑی تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر اسے اٹھالیا تو بڑھیا دعائیں دیتے ہوئے کہنے لگی کہ "بیٹا جس طرح تو نے مجھے اٹھایا ہے اللہ تجھے بھی اس طرح اٹھائے۔"

☆ ---☆--- ☆

جمیل : "اکرم تمہاری مرغی کا کیا حال ہے جو پچھلے ہفتے سائیکل کے نیچے آگئی تھی؟"

اکرم : "اس کا حال تو ٹھیک ہے لیکن انڈے ٹوٹے ہوئے دیتی ہے۔"

☆ ---☆--- ☆

ایک قیدی نے دوسرے قیدی سے پوچھا : "تمہیں کس جرم میں سزا ہوئی ہے؟"

دوسرا قیدی : "میری حکومت سے ضد چل رہی تھی۔"

پہلا قیدی : "کیا مطلب! تم کوئی لیڈر ہو؟"

دوسرا قیدی : "نہیں بھئی! میں بھی حکومت کی طرح نوٹ بناتا تھا۔"

☆ ---☆--- ☆

باپ : "کیوں بیٹا! پیدل چلیں یا کسی سواری پر؟"

بیٹا : "آپ کی مرضی ہے ویسے اگر پیدل چلنا ہے تو مجھے گود میں اٹھالیں۔"

☆ ---☆--- ☆

ایک سیٹھ کو ہوٹل میں ٹھہرنا تھا اس نے انتہائی کم قیمت کا کمرہ کرائے پر لیا۔

ہوٹل مالک : "آپ جب بھی آتے ہیں ایسے ہی کمرہ لیتے ہیں آپ تو سیٹھ ہیں لیکن جب آپ کا لڑکا آتا ہے تو سب سے مہنگا کمرہ لیتا ہے۔ آخر کیوں؟"

سیٹھ صاحب : "جناب میرے لڑکے کا باپ لکھ پتی ہے میرا باپ تو ایک غریب آدمی تھا۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب کنویں میں گر پڑے۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص کا وہاں سے گزر ہوا ان صاحب کو کنویں میں دیکھ کر بڑی حیرانگی سے بولے کہ "تم اندر کیسے پہنچے؟

اندر سے ان صاحب نے بڑے جلے بھنے لہجے میں کہا۔ "میں یہاں بیٹھا تھا لوگوں نے اطراف میں دیواریں چن دیں۔"

☆ --- ☆ --- ☆

دو پہلوانوں کے درمیان ریسلنگ کا بڑا زبردست مقابلہ ہو رہا تھا۔ اچانک ریفری چیخ پڑا۔ "ٹانگ مروڑنی بند کرو۔"

"نہیں آج میں اسے توڑ کر ہی دم لوں گا۔" پہلوان نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف! یہ تمہاری اپنی ٹانگ ہے۔" ریفری نے جواب دیا۔

مرسلہ : عاطف سعید، اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایل بی ڈبلیو کی پانچویں اپیل بھی منظور نہ ہوئی تو باؤلر کو تاؤ آگیا۔ وہ امپائر کی طرف پلٹا اور غصے سے بولا "جناب عالی! آپ یہ بتائیں آپ کی چھڑی کہاں ہے؟"

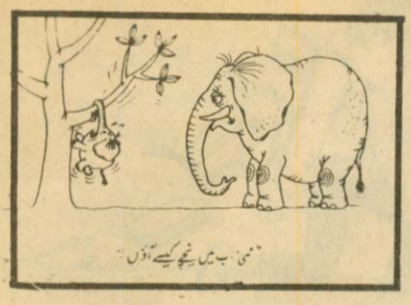

"چھڑی؟ کیسی چھڑی؟ میرے پاس کوئی چھڑی نہیں۔" امپائر نے حیرت سے کہا۔

"کمال ہے؟" باؤلر غرایا "میں نے آج تک کسی نابینا کو بغیر چھڑی کے نہیں دیکھا۔"

مرسلہ : احمر فرقان، ملتان

☆ --- ☆ --- ☆

(ایک روسی ایک پاکستانی سے) "اگر آپ ہماری ملک کی ٹرینوں پر بیٹھیں گے صبح سے شام ہو جائے گی، پھر دوسری صبح ہو جائے گی، اس طرح آپ کے پانچ دن لگ جائیں گے لیکن .... ہمارا ملک ختم نہیں ہو گا۔"

پاکستانی : "اچھا اس کا مطلب ہے ست رفتار ٹرینیں ہمارے ملک میں ہی نہیں آپ کے ملک میں بھی چلتی ہیں۔"

مرسلہ : سید حسن رضا شاہ، ماڈل ٹاؤن ڈیرہ غازی خان

☆ --- ☆ --- ☆

ہمارے بستے کا نوحہ

عباس عالم

دور نہیں اسکول مگر جانے میں بہت دشواری ہے
تم کو کیا معلوم کہ میرا بستہ کتنا بھاری ہے

گھر سے باہر اس کو لے کے جب میں روز نکلتا ہوں
قدم قدم پہ رک جاتا ہوں پھر کچھ سوچ کے چلتا ہوں

ایسا لگتا ہے جیسے کہ دشمن دنیا ساری ہے
تم کو کیا معلوم کہ میرا بستہ کتنا بھاری ہے

اس بستے میں بیس کتابیں مجھ کو رکھنی پڑتی ہیں
نہ رکھوں تو ساری مسوں کی ڈانٹیں چکھنی پڑتی ہیں

ڈانٹیں سنتے رہنا ہی تو اب تقدیر ہماری ہے
تم کو کیا معلوم کہ میرا بستہ کتنا بھاری ہے

فارغ البال

شہباز رشید

"بال" انسانی سر پر سجا ہوا قدرت کا وہ بیش بہا خزانہ جو اگر مردوں کے سر پر ہوں تو یہ پندرہ یا بیس دن بعد نائی کی قینچی کی نظر ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ یہ قدرت کا وہ خزانہ ہے جسے جتنا لٹایا جائے اتنا ہی بڑھتا ہے۔ بہت سے لوگ اس عطیہ خداوندی سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ "فارغ البال" کہلاتے ہیں۔ "یعنی بالوں جیسی عظیم نعمت سے محروم" لیکن فارغ البالی کا ایک مطلب "دولت مندی" بھی ہے۔

اسی لئے ہمارے معاشرے میں گنجے آدمی کو "امیر" تصور کیا جاتا ہے۔ چاہے اس بے چارے کے بال کسی آفت یا مصیبت کے باعث جھڑ جائیں یا بالوں کی کسی بیماری کی وجہ سے وہ خود اپنے "بال" نائی کے سپرد کردے۔

ابتداء میں اگر کسی شخص کے بال سر کے درمیانی حصے سے خزاں رسیدہ پتوں کی مانند

جھڑنے لگیں تو گھر والے خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارے بھی دن پھرنے والے ہیں لیکن کوئی بھی اس غریب کی حالت کا اندازہ نہیں کرتا جو "بالوں سے محرومی" کے اذیت ناک مرحلے سے گزر رہا ہوتا ہے۔

کتنی ظالم ہے یہ دنیا کسی کے جذبات کا خیال ہی نہیں کرتی۔

بال دراصل انسان کی وہ واحد میراث ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ یوں تو بالوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں **مثلاً** سر کا بال، ناک کا بال، داڑھی کا بال، مونچھ کا بال وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جو عزت و احترام اسے انسانی سر پر آویزاں ہونے کے بعد ملتا ہے وہ اس کی دوسری اقسام کو حاصل نہیں۔ قدرتی طور پر بال تین رنگوں میں پائے جاتے ہیں لیکن کالے رنگ کے بال با آسانی اور زیادہ دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک بال وہ بھی ہوتا ہے جو بے چارہ قرضے میں جکڑا رہتا ہے۔ یہ محاورے کا بال ہے جس کا استعمال آج کل تیزی سے بڑھ رہا ہے **مثلاً** پاکستانیوں کا بال بال قرضے میں جکڑا جا چکا ہے۔ گنجے آدمی کو کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو یہی فائدہ بہت ہے کہ قرض جیسے مرض سے بچا رہتا ہے چاہے وہ کتنا ہی مقروض کیوں نہ ہو کوئی شخص اسے یہ طعنہ نہیں دے سکتا۔ "میاں تمہارا تو بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔"

ایک زمانہ تھا جب لڑکے اور لڑکیوں میں تفریق کا سب سے بڑا ذریعہ "بال" تھے۔ لیکن اب یہ بال لڑکیوں کے سروں پر تو ناپید ہو چکے ہیں۔ البتہ لڑکوں نے بالوں سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں اپنے سروں پر مستقل سجانے کا عہد کر رکھا ہے اور بالوں کی اس زرخیزی میں تیزی سے اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ اب ہمیں معلوم نہیں اس گھر کی کھیتی کو اس قدر زرخیز بنانے کا لڑکوں کے پاس کیا نسخہ ہے؟ ہمارا خیال ہے کھاد کا مناسب استعمال اس کی پیداوار میں اضافے کا سبب بن رہا ہے۔ لڑکوں کے حوالے سے کچھ چیزیں پہلے ہی تبصروں کی زد میں رہتی تھیں۔ **مثلاً** لمبا قد، لمبی ناک، لمبا منہ اور اب ستم بالائے ستم "لمبے بال"۔

کل تک دوشیزاؤں کے لمبے، گھنے بال بہت مشہور ہوا کرتے تھے آج کل لمبے اور گھنے جنگلات کی طرح دوشیزاؤں کی زلفیں بھی کم ہو کر رہ گئیں اور لمبے بالوں کی بیماری نے لڑکوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جب اچانک ہی نوجوان نسل میں بالوں کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ شروع ہوا تھا تو ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہر

بچے کی زبان پر یہ سوال تھا۔

کیوں بال ہیں لمبے بھائی کے
کیا شہر میں کوئی نائی نہیں

لیکن شہر میں نائیوں کی تعداد میں ہرگز کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ بالوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد نے بے چارے "نائیوں کے حق" پر شدید ڈاکہ ڈالا ہے جس کے باعث بہت سے نائی بے روزگاری کا شکار ہوگئے اور آج کل بھی نائیوں کا کاروبار مندی کا شکار ہے۔

ہم نوجوان نسل سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ خدارا اپنے بالوں کی قربانی دے کر نائیوں کو ان کا حق واپس دے دیجئے بال تو پھر بال ہیں انہیں جتنا لٹایا جائے اتنے ہی بڑھتے ہیں۔ ناک کا بال البتہ وہ بال ہے جو لوگ کسی کو نہیں دیتے یہ سب سے قیمتی بال ہوتا ہے اس کی ضرور حفاظت کرنا چاہئے مونچھ اور داڑھی کے بالوں کے بارے میں ہم کچھ کہہ نہیں سکتے البتہ مونچھوں کی صفائی کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو چکی ہے اور "مونچھ کی صفائی" ایک معمہ بن چکی ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ ہم نے بالوں کے متعلق جو کچھ کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "بال" کسی بھی قسم کے ہوں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں البتہ بالوں کے بارے میں ہمارا اتنا پیچیدہ و سنجیدہ مضمون پڑھ کر آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ہمیں بھی "بال" کی کھال نکالنے میں کمال حاصل ہے۔

●●●

بھلکڑ

۱۔ وہ ڈوب گیا، کیونکہ وہ بھول گیا تھا کہ اسے تیرنا آتا ہے۔

۲۔ اس کا پرچہ بہت اچھا ہوا تھا۔ وہ فیل نہ ہوتا اگر وہ اپنا پرچہ جمع کرانا نہیں بھولتا۔

۳۔ اس نے ایک کتاب خریدی جس کا نام تھا "بھولنے کی عادت سے چھٹکارا پائیے"۔ لیکن پھر ہوا یہ کہ وہ کتاب دکان پر ہی بھول آیا۔

مرسلہ : ہما شریف صدیقی، کراچی

جھوٹا

مومن رحیم

ٹرین نے اسٹیشن چھوڑنے کا اعلان سیٹی بجا کر کیا۔ میرے علاوہ ٹرین میں کئی افراد سوار تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر اور گھٹے ہوئے جسم کا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے برابر میں ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل ۲۵ سال ہوگی میرے برابر کی سیٹ خالی تھی شاید اس سیٹ کی بکنگ کسی آگے کے اسٹیشن سے ہوئی ہوگی۔

میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے تایا کے گھر بہاولپور جارہا تھا اور ٹرین میں اکیلے سفر کرنے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس لئے سفر کی بوریت کو دور کرنے کے میں نے اپنے ساتھ کچھ کتابیں رکھ لیں تھیں۔

میرے سامنے بیٹھا نوجوان جو شاید عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑا ہوگا کھڑکی سے باہر کے منظر سے لطف اندوز ہورہا تھا اور ادھیڑ عمر شخص

سیٹ سے گردن ٹکائے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے اور یہ اجنبیت کسی نے بھی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹرین تقریباً" ڈھائی گھنٹے بعد حیدر آباد کے اسٹیشن پر رکی اور چار چھ منٹ بعد پھر روانہ ہوگئی۔اس کے بعد مزید کتنا فاصلہ طے ہوا اس کا اندازہ مجھے نہ ہوسکا۔ کیونکہ میں کتاب کی ورق گردانی کرتے کرتے اونگھ رہا تھا۔میری آنکھ ٹکٹ چیکر کے آنے سے کھلی۔ میں نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا۔ اسی اثناء میں ادھیڑ عمر کا آدمی بھی اپنا ٹکٹ چیک کراچکا تھا۔ ٹکٹ چیکر جب نوجوان کے پاس پہنچا تو نوجوان نے ٹکٹ چیکر سے کہا "معاف کیجئے گا" میں پچھلے اسٹیشن سے سوار ہوا ہوں۔ جلدی میں ٹکٹ نہ لے سکا۔ مجھے لاہور جانا ہے آپ مجھ سے پیسے لے کر ٹکٹ بنادیجئے۔" ادھیڑ عمر آدمی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔" ٹھہریئے جناب! یہ نوجوان جھوٹ بول رہا ہے یہ پچھلے اسٹیشن سے نہیں بلکہ ٹرین جہاں سے روانہ ہوئی ہے یہ حضرت وہاں سے سوار ہوئے ہیں۔"

ٹکٹ چیکر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیوں نوجوان! کیا یہ بات درست ہے؟"

نوجوان غصے سے ہونٹ کاٹتا ہوا دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ٹکٹ چیکر نے اسے ڈبے سے اتارا اور اسٹیشن ماسٹر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین دوبارہ روانہ ہوگئی۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے لیکن کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی یک لخت وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا۔ "نوجوان! تم یقیناً" یہ محسوس کررہے ہوگے کہ میں نے اس نوجوان کے ساتھ جو کیا وہ اس کی بہتری کے لئے کیا ہے!!!"

"محترم! میں تو کچھ محسوس نہیں کررہا ہوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"شاید تم کو یہ اقدام پسند نہیں آیا۔ لیکن تمہارا فرض تھا کہ پوچھتے میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟"

"اگر آپ بتانا ہی چاہتے ہیں تو مجھے سننے میں کوئی اعتراض نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو دوسروں کو ان کے عیبوں کی فہرست دکھاتے پھرتے ہیں۔"

"جی نہیں! برخوردار ایسی کوئی بات نہیں۔" اس شخص نے کہا۔

پھر وہ مخاطب ہوا۔ "میرا نام شوکت علی ہے میں ایک بے اصول آدمی ہوں۔میں نے زندگی میں کبھی سچ نہیں بولا اور اب میں جھوٹ بولنے کا اس قدر عادی ہوچکا ہوں کہ اب جھوٹ بولے

بغیر ایک لحظہ بھی نہیں رہ سکتا۔ ایک جھوٹ دوسرے جھوٹ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ جھوٹ آدمی کو سچ سے اتنی دور لے جاتا ہے کہ آدمی پلٹ نہیں سکتا۔ اس لئے میں نے اس نوجوان کا جھوٹ فاش کیا تاکہ وہ آئندہ جھوٹ نہ بولے اور اس لعنت سے ہمیشہ بچا رہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ شخص اپنے خیالات کو یکجا کرتے ہوئے مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔

"زندگی میں کوئی ثانیہ ایسا نہ گزرا کہ میں نے جھوٹ نہ بولا ہو۔ سب سے پہلا جھوٹ میں نے اپنی ماں کے خوف سے بولا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ بچپن میں جب کوئی شرارت کرتا جھوٹ بول کے اپنی جان بچالیتا۔ اس لئے کہ سچ بولنے سے اکثر مار کھانی پڑتی تھی۔ گھر کے بعد میں نے مزید جھوٹ بولنا اسکول میں سیکھا۔ میں جب بھی اسکول کا کام نہ کرتا تو جھوٹ کا سہارا لیتا۔ اس کے بعد عملی زندگی کا آغاز بھی جھوٹ کی بنیاد پر رکھا اور کاروبار میں اتنا جھوٹ بولا کہ مجھے سچ کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ جھوٹ سے میں نے بہت روپیہ کمایا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی اور پھر ایک دن اچانک ایسی بات ہوگئی کہ جھوٹ بھی میرے کام نہ آسکا۔ ہوا یوں کہ میرے بزنس پارٹنر سے میرا کسی بات پر اختلاف ہوگیا۔ بات جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی۔ یہ سارا جھگڑا پورے آفس کے سامنے ہوا۔ آفس سے گھر آتے آتے میں اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ مجھے دوسرے دن یہ پارٹنرشپ ختم کرنی پڑے گی اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد ذہن کچھ پُرسکون ہوا۔

لیکن دوسرے دن آفس پہنچنے پر جو سب سے پہلی بری خبر سننے کو ملی وہ یہ تھی کہ میرے پارٹنر کو رات اس کے گھر میں کسی نے قتل کردیا تھا یہ خبر میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ مجھ سے دفتر میں نہ بیٹھا گیا اور وہاں سے گاڑی دوڑاتا سیدھا اپنے پارٹنر کے گھر روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچنے پر پولیس انسپکٹر کے کچھ سوالات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور عادتاً" کچھ سوالوں کے جواب میں نے جھوٹ بول کردیئے۔ جس سے میری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ کیونکہ میرے پارٹنر جمیل کی بیوی نے اپنے بیان میں اپنے شوہر کے قتل کا مجھ پر شک ظاہر کیا تھا۔ جس کی وجہ سے پولیس والے کئی دفعہ میرے گھر اور آفس بھی آئے۔

اور بالآخر ہفتہ بھر بعد قتل کے الزام میں پولیس نے مجھے آفس سے گرفتار کرلیا۔ میں نے فوراً" ہی ایک کامیاب وکیل کی خدمات حاصل کیں۔

بات عدالت تک جا پہنچی۔ دو ایک پیشیوں کے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہوگئی اور آخر کار کچھ دنوں بعد جج نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میرے لئے موت کی سزا تجویز کی گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ فیصلہ سننے کے بعد میں بہت چیخا کہ میں بے گناہ ہوں اور بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا اور پھر میری آنکھ جیل کی کوٹھڑی میں کھلی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد کئی روز تک میں بہت چیختا چلاتا رہا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور آخر کار وہ بھیانک دن بھی آپہنچا جس دن میرے ناکردہ گناہ کی سزا مجھے ملنی تھی۔ ساری رات پلک جھپکائے بغیر گزاری اور صبح ہی صبح مجھے دو پولیس والے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آموجود ہوئے۔"

اتنا کہہ کر شوکت علی لمحہ بھر کو رکا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس کو سلگا کر گہرا کش لیتے ہوئے پھر مخاطب ہوا۔"میرا خیال ہے کہ میں اس نوجوان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے میں حق بجانب تھا۔" اور یہ کہہ کر وہ اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔"یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ پھر آپ کی سزائے موت عین موقع پر کیسے منسوخ ہوئی اور آپ کو کیسے رہائی ملی کیا اصل قاتل پکڑا گیا تھا؟"

سامان سمیٹتے ہوئے اس نے کہا۔"سزا تو منسوخ نہیں ہوئی تھی۔"

"کیا مطلب!" میں نے حیرانی سے کہا؟

"بیٹا! اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم سوچ رہے ہوگے کہ جب سزا منسوخ نہیں ہوئی تو میں یہاں کیسے موجود ہوں۔ تو بھئی! یہ ایک سیدھی سی بات ہے۔ میں تم سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں ناقابلِ اصلاح حد تک جھوٹا ہوں میں نے زندگی میں کبھی سچ نہیں بولا۔"

یہ کہہ کر وہ ٹرین سے اتر گیا۔ ●●●

آٹو گراف

- سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کرو۔
- اپنے راز کو پوشیدہ رکھنا اپنی عزت بچانا ہے۔
- کیا تمہیں بڑا بننے کی خواہش ہے۔ بڑا بننا چاہتے ہو تو پہلے چھوٹے بنو۔
- آپ کے ضمیر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔
- اونچے پہاڑ پر جانے کے لئے آہستہ آہستہ چڑھنا پڑتا ہے۔

کرکٹ کے دلچسپ ریکارڈ

سید فرحان علی

۱۔ کرکٹ میں یوں تو آؤٹ ہونے کے کئی طریقے ہیں مثلاً" بولڈ' ایل بی ڈبلیو' کیچ آؤٹ' اسٹمپ' رن آؤٹ' لیکن آؤٹ ہونے کا ایک طریقہ ایسا بھی ہے جس کا تمام تر سہرا بیٹسمین کو جاتا ہے اور وہ ہے "ہینڈلڈ دی بال" یعنی وکٹوں میں جاتی گیند کو ہاتھ سے روکنا۔

ٹیسٹ کرکٹ میں اب تک صرف چار کھلاڑی ہینڈ ٹو دی بال آؤٹ قرار دیئے گئے ہیں۔

کھلاڑی	ملک	بمقابلہ	مقام	سیزن
1_ رسل اینڈین	جنوبی افریقہ	انگلستان	کیپ ٹاؤن	1956-57
2_ اینڈرپوہلڈچ	آسٹریلیا	پاکستان	پرتھ	1978-79
3_ محسن حسن خان	پاکستان	آسٹریلیا	کراچی	1982-83
4_ ڈیسمنڈہینز	ویسٹ انڈیز	بھارت	بمبئی	1983-84

2۔ایک ٹیسٹ میچ میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے کا ریکارڈ انگلستان کے جم لیکر نے قائم کیا۔ انہوں نے 26 سے 31 جولائی 1956ء کو آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ میچ میں انیس (19) وکٹیں حاصل کیں۔ انہوں نے پہلی اننگ میں 37 رنز کے عوض 9 وکٹیں اور دوسری اننگ میں 53 رنز دے کر 10 وکٹیں حاصل کیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آسٹریلیا کی بیسویں وکٹ کسی بالر نے حاصل نہیں کی بلکہ وہ رن آؤٹ ہوئے۔

چالیس سال گزر جانے کے باوجود یہ ریکارڈ اب بھی قائم ہے۔

ٹیسٹ میچ کھیلنے والے سب سے کم عمر کھلاڑی

پاکستان کے مشتاق محمد ٹیسٹ میچ کھیلنے والے دنیا کے کم عمر ترین کھلاڑی ہیں انہوں نے اپنا پہلا ٹیسٹ 26 مارچ 1959ء کو لاہور میں ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلا اس وقت ان کی عمر 15 سال 124 دن تھی۔

ٹیسٹ میچ کھیلنے والے طویل العمر کھلاڑی

انگلستان کے ولفرڈ رہوڈز نے 12 اپریل 1930ء کو اپنے کیریئر کا آخری ٹیسٹ کھیلا تو ان کی عمر 52 سال 165 دن تھی۔ وہ ٹیسٹ میچ کھیلنے والے سب سے معمر کھلاڑی ہیں۔

ایک ٹیسٹ میچ میں سب سے زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑی

26 سے 31 جولائی 1990ء کو لارڈز میں بھارت کے خلاف کھیلتے ہوئے انگلستان کے بیٹسمین گراہم گوچ نے پہلی اننگز میں 333 اور دوسری اننگز میں 123 رنز بنائے اس طرح انہوں نے کل 456 رنز اسکور کئے ایک ٹیسٹ میچ میں اتنے زیادہ رنز اور کسی کھلاڑی نے نہیں بنائے۔

ہر ملک کی جانب سے پہلی ٹیسٹ سنچری

ملک	کھلاڑی	بمقابلہ	رنز	مقام	سیزن
انگلستان	ڈبلیو جی گریس	آسٹریلیا	152	اوول	1880ء
آسٹریلیا	چارلس بینرمین	انگلستان	165	میلبورن	1877ء
جنوبی افریقہ	جے سنکلیئر	انگلستان	106	کیپ ٹاؤن	99-1898ء
ویسٹ انڈیز	کلف روچ	انگلستان	122	برج ٹاؤن	30-1929ء
نیوزی لینڈ	سی۔ ایس۔ ویمپسر	انگلستان	136	ویلنگٹن	30-1929ء
بھارت	لالہ امرناتھ	انگلستان	118	بمبئی	34-1933ء
پاکستان	نذر محمد	بھارت	124	لکھنؤ	53-1952ء
سری لنکا	سداتھ ویٹیمنی	پاکستان	157	فیصل آباد	82-1981ء
زمبابوے	ڈیوڈ ہاؤٹن	بھارت	121	ہرارے	93-1992ء

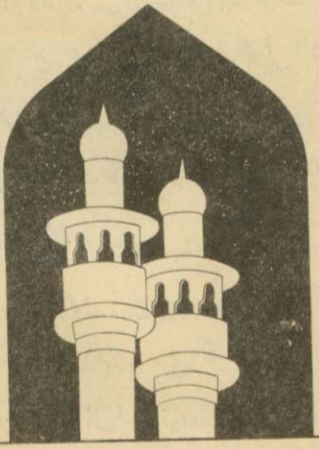

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

جس شخص پر کوئی مشکل آئے یا کوئی حاجت ہو اس کو چاہئے کہ کثرت سے مجھ پر درود پڑھے کیونکہ درود کی کثرت رنج و غم کو دُور کرتی ہے اور رزق کو زیادہ کرتی ہے۔

یاد رکھیئے دل کی قوت ذکرِ الٰہی میں دماغ کی توانائی تلاوتِ قرآن میں جسم کی تندرستی نماز میں اور روح کی راحت درود شریف میں ہے

مرسلہ : رابعہ، ملتان کینٹ

کیا گُل کِھلا رہا ہے نیا دَور دیکھ

دیکھئے اور بہ غور دیکھئے کہ جدید ٹیکنالوجی نے دنیا کو اسیر ہی نہیں تسخیر بھی کر لیا ہے۔ وقت کا منادی یہی صدا دے رہا ہے کہ ۲۱ ویں صدی میں وہی قومیں زندہ رہیں گی جو خود کو جدید تر علوم و فنون اور ٹیکنالوجی سے آراستہ کریں گی۔

کون مقابل آیا جھنڈا اکیوں لہرایا

پھسلو کچھ اس ادا سے
کہ جھنڈا کھڑا رہے

کار ریسنگ کا جھنڈا

فتح کی علامت اور ریس
ختم کرنے کا اعلان

مقابلوں کے رنگ برنگے جھنڈے

فٹبال کے میچ میں لائن مین کے جھنڈے

کھیلوں کی لمبی جھنڈی
جب لہرائے۔ من کو بھائے

اقوام متحدہ کے جھنڈے کے
بعد پہلا عالمی جھنڈا
اولمپک کا جھنڈا

اسٹیڈیم کی تزئین
کیلئے تکونی جھنڈیاں

حدود کا تعین کرنے والی
سمتوں کی نشاندھی کرنے والی
پلاسٹک کی جھنڈیاں

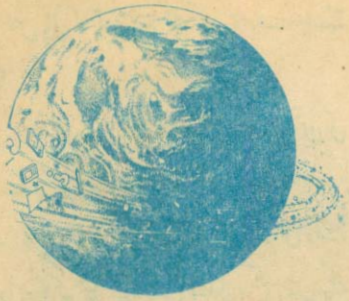

قصہ کوئز ۶

سلیم مغل

ایسے واقعات جن سے جذبہ کو مہمیز ملتی ہو' ایسے حقائق جو ذہن و دل کو متاثر کرتے ہوں۔ محیرالعقول واقعات اور دنیا پر اپنے نقش چھوڑنے والی شخصیات کے بارے میں آپ کی معلومات کا انوکھا امتحان "قصہ کوئز" پیشِ خدمت ہے۔ تمام واقعات کو غور سے پڑھئے اور سوچ سمجھ کر جواب دیجئے۔ جواب کی تلاش میں والدین' اساتذہ' احباب' اور کتابوں کی مدد لیجئے ۱۵ یوم کے اندر اپنے جوابات بھجوادیجیے۔ ہمارے کامیاب امیدواروں میں سے تین کے لئے بہترین انعامات موجود ہیں۔ (مرتب)

۱۔ بچہ پیاس سے تڑپ رہا ہے اور ماں سے بچے کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی' ماں اس پہاڑی سے لے کر اس پہاڑی تک کہاں کہاں نہیں دوڑتی کہ کسی طرح بچے کے لئے چند گھونٹ پانی میسر آجائے۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے اور اس کیفیت میں ماں کا کلیجہ پھٹا جارہا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

ایسے میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوتا ہے۔ بہ ظاہر ناقابلِ یقین مگر دراصل حقیقت۔

بچہ جس جگہ پر لیٹا ہوا رو رہا ہے وہیں ایڑیاں رگڑنے کی جگہ پر زمین سے پانی پھوٹ پڑتا ہے۔ ماں کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے چمک جاتی ہیں۔ وہ بچے کو پانی پلاتی ہے اور اس غیبی مدد پر بے حد شکر گزار ہوتی ہے پانی کا وہ چشمہ آج بھی لاکھوں لوگوں کو سیراب کرتا ہے لوگ اس پانی کو آبِ شفا سمجھتے ہیں' تعظیم سے پیتے ہیں' احترام سے اٹھاتے اور رکھتے ہیں' اس پانی کا تحفہ دینا اور لینا باعثِ سعادت سمجھا جاتا ہے۔

۱۔ اس پانی کو آپ اور ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

۲۔ اس ماں اور بچے کا نام بھی بتایئے جن کی وجہ سے چشمہ پھوٹنے کا واقعہ ظہور پذیر ہوا؟

2۔ دیگچی میں کھانا پک رہا تھا۔ کچھ ہی وقت گزرا ہوگا کہ تیز آنچ پر رکھی ہوئی دیگچی میں پکنے والا کھانا ابلنے لگا۔ دیگچی کا ڈھکنا ہلنا شروع ہوا تو اس نے سوچا کہ یہ ڈھکنا کیوں ہل رہا ہے۔ پھر وہ ڈھکنا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ بہ ظاہر تو معمولی سا واقعہ تھا جو ہر روز ہر گھر میں پیش آتا ہے۔ مگر محض ڈھکنے کے ہل جانے سے اس کے ذہن میں جو سوال پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ "وہ کون سی قوت ہے جس نے لوہے کے اس وزنی ڈھکنے کو اس کی جگہ سے ہٹادیا؟" اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قوت اگر بڑی تعداد میں جمع کرلی جائے تو اس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں۔ ہاں لئے جاسکتے ہیں۔ اپنے اٹھائے ہوئے سوال کا جواب بھی مل گیا تھا۔ وہ پُرعزم تھا اور پھر اس نے تجربات شروع کردیئے وہ تحقیق کرتا اور تجربوں کے مراحل سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک بڑی ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھ لیا۔

۱۔ کون سی ایجاد کا سہرا اور یہ بتائیں کہ وہ قوت کون سی تھی جس سے یہ ایجاد ممکن ہوئی؟

۲۔ موجد کا نام بھی بتایئے؟

3۔ "اس برصغیر میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا ہے۔ وہ مینارِ قرار داد پاکستان ہے۔ یوں تو مینار اور مسجد آمنے سامنے ہیں مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہے، تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان تین گمشدہ صدیوں کا ماتم کررہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی، جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہوجائیں۔ جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہوجائے تو صدیاں یونہی گم ہوجاتی ہیں۔"

یہ اقتباس اردو کی ایک ایسی کتاب سے لیا گیا ہے جو علم و ادب کے حوالے سے شاہکار کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۱۔ کتاب اور اس کے مصنف کا نام بتایئے؟

۲۔ مصنف کی تازہ ترین کتاب کا عنوان کیا ہے؟

4۔ دیبل کا قلعہ مسلمانوں کے محاصرے میں

تھا۔ ایک طرف سے مسلمانوں کے حملے جاری تھے تو دوسری طرف قلعہ بند ہندو فوج جوابی حملے کررہی تھی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی برتری واضح تھی لیکن اس کے باوجود داہر کی فوجیں ہار ماننے کو تیار نہ تھیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کو ایک کام کی بات معلوم ہوگئی۔ پتہ یہ چلا کہ "دور نظر آنے والے مندر پر جب تک ہندوؤں کا پرچم لہراتا رہے گا' ہندو یہ سمجھتے رہیں گے کہ ابھی دیوتا ان کے ساتھ ہے۔ دیوتا کے ساتھ دینے کا خیال انہیں مایوس نہیں ہونے دے گا۔" اس معلومات کی بنیاد پر مسلمانوں نے نئی حکمتِ عملی وضع کی اور طے کیا کہ اس قلعے اور جھنڈے کو نشانہ بنانا چاہئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی چیز بنالی گئی جو بھاری پتھروں کو پوری قوت کے ساتھ دور تک پھینک سکتی ہو اور پھر اس مشین کے ذریعہ پتھروں کی برسات کا عمل شروع ہوگیا۔ قلعہ کے اندر مندر نما عمارت کا پرچم جونہی گرا' ہندو فوج حوصلہ ہار بیٹھی اور محمد بن قاسم کے سامنے ہتھیار پھینک کر ڈھیر ہوگئی۔

۱۔ اس مشین کو عرف عام میں کیا کہتے ہیں جس سے پتھر برسائے گئے؟

۲۔ عرب مسلمانوں کی بنائی ہوئی اس مخصوص مشین کا نام کیا تھا جس نے آگے چل کر توپ کی شکل اختیار کی؟

5 ۔ "جارجیا" کے قصبے "گوری" میں پیدا ہونے والا یہ بچہ ایک زرعی غلام کا بیٹا تھا۔ تین بھائی اللہ کو پیارے ہوئے تو یہ پیدا ہوا تھا۔ماں باپ کی خواہش تھی کہ اسے پڑھا لکھا کر پادری بنایا جائے۔لہٰذا اسے ایک ایسے دارالعلوم میں داخل کردیا گیا جہاں دینی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اپنے مکتب کا اچھا طالب علم ہونے کے باوجود اسے "آنہ لائبریری" کی سستی اور گھٹیا کتابیں پڑھنے کی لت پڑگئی تھی۔ وہ چوری چھپے جاتا اور کرائے پر سستی کتابیں خرید کر لے آتا۔ وہ کئی بار پکڑا بھی گیا اور اسے سرزنش بھی ہوئی مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے مدرسے کے اساتذہ سے چھپ چھپ کر ایک انقلابی تنظیم کے اجلاس میں شرکت کرنا بھی شروع کردی تھی۔ اب اس کی ساری دلچسپی انقلاب میں تھی۔ مدرسہ اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ آخر کار وہ مدرسے سے نکال دیا گیا۔ مدرسہ چھوٹنے کی دیر تھی' اس نے کھل کر سیاست میں اپنی دلچسپی کا اظہار شروع کردیا۔ کتنی مرتبہ جیل گیا اور پھر جیل سے بھاگ نکلا۔ اس کی آرزو پوری ہوئی اور آخر کار انقلاب آگیا۔ اس کا شمار انقلاب لانے والے چند اہم رہنماؤں میں ہوتا

ہے وہ ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی رہا۔

۱۔ بتایئے ہم کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟

۲۔ کیا آپ اس عظیم انقلابی کے کسی اور ساتھی رہنما کا نام بتا سکتے ہیں؟

قصہ کوئز (ماہ جنوری ۹۷ء) کے درست جوابات

۱۔ (الف) طارق بن زیاد

(ب) اندلس

۲۔ (الف) گاما پہلوان

(ب) امرتسر

۳۔ (الف) کیپٹن محمد سرور شہید

(ب) نشان حیدر

۴۔ (الف) جنگ عظیم (اول)

(ب) اتحادی فوجیں برطانیہ، فرانس، امریکہ وغیرہ فاتح

جرمنی، اور اس کے اتحادی مفتوح

۵۔ (الف) حیدر علی

(ب) ٹیپو سلطان

قصہ کوئز ۵ کے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی۔

اس بار ایک جنرل غلطی کے باوجود درج ذیل دو ساتھیوں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا:

(۱) ریحانہ احمد، لاہور

(۲) محمد شعیب حسن، لاہور

●●●

پاکستان کی پہاڑی چوٹیاں

سید ذیشان صادق، محمد نگر کوہاٹ

چوٹی	سلسلہ ہائے کوہ	بلندی فٹوں میں
کے_ٹو (گاڈون آسٹن)	قراقرم	28250
نانگا پربت (کشمیر)	ہمالیہ	26620
ترچ میر	ہندوکش	25365
راکاپوشی	ہارموش	25550
منکیال	ہارموش	19000
تخت سلیمان	کوہ سلیمان	11000

اخلاق احمد

اغوا

سردیاں آچکی تھیں۔

اور اس دن تو بادل چھائے ہوئے تھے۔ دھوپ نہیں تھی لہٰذا دن کے وقت بھی سردی تھی۔ ہوا چلتی تھی تو یونیفارم کے اوپر پہنے جانے والے سوئیٹروں کے باوجود جیسے بدن کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی تھی۔

"حق اسکواڈ" کے چاروں ارکان ..... شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد۔ اس دن ہیڈ

کوارٹر میں داخل ہوئے تو باہر چلنے والی سرد ہوا کے مقابلے میں، اس غار کے اندر انہیں سکون کا احساس ہوا۔

"توبہ توبہ۔" سرفراز نے اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔ "کس قدر سردی ہے۔"

"ہاں۔" شہزاد نے اپنے ہاتھ پتلون کی جیب میں گھساتے ہوئے کہا۔ "اور ہم کس قدر احمق ہیں کہ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر جانے کے بجائے شہریار کے کہنے پر یہاں ہیڈ کوارٹر چلے آئے ہیں۔"

"بک بک مت کرو۔" شہریار نے کہا۔ "کام شروع کرو۔"

اور انہوں نے کام شروع کردیا۔

شہزاد نے کیتلی میں پانی بھرا۔

شہریار نے چولہا جلا کر چائے بنائی۔

ضیاء نے پورے غار کی صفائی کی۔

ہمیشہ کی طرح سرفراز اطمینان سے بیٹھا رہا۔ اسے آخر میں برتن دھونے تھے۔

گرم گرم چائے کا پہلا گھونٹ لے کر ضیاء نے کہا۔ "اب بتاؤ بھائی شہریار، کیا پریشانی لاحق ہے تمہیں؟"

شہریار نے بھی مگ اٹھا کر چائے کا گھونٹ بھرا اور کہا "اس بار ایک بہت سیدھا سادہ سا معاملہ ہے دوستو ..... بے حد سیدھا سادہ معاملہ۔"

سرفراز ہنسا۔ "ہر بار تم کوئی سیدھا سادہ معاملہ ہی لے کر آتے ہو۔ مگر آخر میں وہ بے حد ٹیڑھا معاملہ ثابت ہوتا ہے۔"

شہزاد بولا۔ "اس بار کتنا سیدھا سادہ معاملہ ہے کیا بالکل جلیبی کی طرح سیدھا ہے؟" شہریار نے ایک اور گھونٹ بھرا اور کہا "کلیم اور فہیم کو جانتے ہو نا تم لوگ؟"

ضیاء نے پوچھا۔ "کون کلیم اور فہیم؟"

"وہی دونوں بھائی۔" شہریار نے کہا۔ "جو ایک بے حد جگمگاتی کار میں اسکول آتے ہیں۔"

سرفراز نے کہا۔ "اچھا، اچھا وہ سرخ رنگ کی کار والے لڑکے۔ ایک نویں میں پڑھتا ہے اور ایک ساتویں میں۔ سنا ہے کسی کروڑ پتی گھرانے کے لڑکے ہیں۔"

شہریار نے سنجیدگی سے کہا۔ "بالکل ٹھیک پہچانا تم نے وہ کسی کروڑ پتی باپ کے بیٹے ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے والد کی کئی فیکٹریاں ہیں جہاں سینکڑوں لوگ ملازم ہیں۔ ان کے گھر میں آٹھ گاڑیاں ہیں۔ وہ سب کچھ ہے جو بے حد امیر لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔"

"بھائی شہریار۔" شہزاد نے کہا۔ "آپ کو کیا

پریشانی ہے؟ ان کے گھر میں آٹھ گاڑیاں ہو یا آٹھ سو گاڑیاں ہوں۔" شہریار نے سرہلایا۔

"نہیں دوستو! مجھے ان کی گاڑیوں کی تعداد پر کوئی پریشانی نہیں ہے۔ لیکن ان کی دولت ہمارے اسکول کے طالب علموں کے لئے پریشانی بن رہی ہے۔"

"وہ کیسے؟" ضیاء نے حیرت سے پوچھا۔

"کلیم اور فہیم ایک دولت مند گھرانے کے لڑکے ہیں۔" شہزاد نے کہا۔ "اور ان کے والد ان کو روز جیب خرچ کے طور پر ایک سو روپے دیتے ہیں۔"

"ایک سو روپے!" سرفراز نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "روز ایک سو روپے دیتے ہیں۔"

"ہاں۔" شہریار نے کہا۔ "روز ایک سو روپے دیتے ہیں۔ کلیم اور فہیم ہر روز سَو سَو روپے خرچ کرتے ہیں۔ وہ ٹھنڈی بوتلیں پیتے ہیں۔ بن کباب کھاتے ہیں، پیسٹریاں اور آئس کریم خریدتے ہیں۔ اپنے قریبی دوستوں کو بھی خوب کھلاتے پلاتے ہیں لیکن اس سے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اسکول میں ہر طرح کے طالب علم ہوتے ہیں، ان میں بے حد غریب گھرانوں کے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں جو جیب خرچ کے طور پر ایک روپیہ یا دو روپے لے کر آتے ہیں۔ بعض تو پیسے لاتے ہی نہیں ہیں۔ گھر سے کچھ کھانے پینے کو لے آتے ہیں اور بس۔ جب یہ غریب طالب علم کلیم اور فہیم جیسے لڑکوں کو اندھا دھند پیسے خرچ کرتے دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش! ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی۔ کاش ہمارے والدین بھی اتنے امیر ہوتے۔ کاش! ہم بھی اسی بے فکری سے پیسے خرچ کرسکتے۔ کلیم اور فہیم دولت کی جو نمائش کررہے ہیں اس سے دوسرے بچوں میں احساسِ کمتری پیدا ہورہا ہے۔ وہ خود کو غریب محسوس کررہے ہیں۔ کلیم اور فہیم کے مقابلے میں کمتر محسوس کررہے ہیں۔ یہ جو کچھ ہورہا ہے، ٹھیک نہیں ہورہا ہے۔"

کچھ دیر تک غار میں خاموشی چھائی رہی۔

بالآخر سرفراز نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی طرح کلیم اور فہیم کے والد سے بات کرنی چاہئے۔ انہیں سمجھانا چاہئے کہ وہ ٹھیک نہیں کررہے ہیں۔"

"ہاں۔" شہزاد بولا۔ "یہ اچھا آئیڈیا ہے۔"

"یہ نہایت فضول آئیڈیا ہے۔" شہریار نے کہا۔ "ہمارے اسکول کے ایک استاد یہ کام کرنے کی کوشش کرچکے ہیں۔ کلیم کے کلاس ٹیچر

نجم صاحب نے ایک بار ان کے والد کے نام ایک خط بھجوایا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دیئے جانے والے جیب خرچ میں کمی کریں کیونکہ اس سے دوسرے بچوں پر خراب اثر پڑتا ہے۔ جواب میں ان کے والد نے نجم صاحب کو ایک بے حد سخت قسم کا خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ استاد کو بچوں کو پڑھانے سے کام رکھنا چاہئے اور بے مقصد باتوں میں نہیں الجھنا چاہئے۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ دولت مندوں کے بچے اسی طرح پرورش پاتے ہیں اور اگر کلیم اور فہیم کے جیب خرچ کی وجہ سے غریب بچے پریشان ہو رہے ہیں تو اس میں قصور ہماری دولت کا نہیں بلکہ ان بچوں کی غربت کا ہے۔"

شہزاد نے غصے سے کہا۔ "یہ کون آدمی ہے جس نے ہمارے استاد کو اس طرح کا خط لکھا۔ اس کو چل کر ٹھیک نہ کریں؟"

شہریار مسکرایا۔ "غصہ نہیں شہزاد ہر کام ٹھنڈے دل سے کرنا چاہئے اس آدمی کا نام سیٹھ الیاس ہے اور شہر کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہے۔ ایسے آدمی کا مقابلہ جوش سے نہیں، ہوش سے کرنا ہوگا سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گئے۔" سرفراز نے ہنس کر کہا۔ "مطلب یہ ہے کہ اب حق اسکواڈ کو پھر ایکشن میں آنا ہوگا۔ میدان میں نکلنا ہوگا۔"

وہ چاروں وہاں بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ منصوبے بناتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ وہاں سے اٹھے تو ان کے چہرے جگمگا رہے تھے اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

☆ --- ☆ --- ☆

یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔

سیٹھ الیاس اپنے عالیشان دفتر میں بیٹھا تھا اور کام میں مصروف تھا۔

اس کی میز پر چار ٹیلیفون تھے۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی گھڑی تھی۔ وہ ایک ٹیلیفون پر پشاور بات کر رہا تھا اور لاکھوں کا سودا طے کر رہا تھا۔ بات ختم ہوئی اور اس نے ٹیلیفون رکھا تو دوسرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دبئی سے ایک اور کاروباری گروپ کا سربراہ بات کر رہا تھا۔ ایک بار پھر لاکھوں کا سودا ہونے لگا۔ اسی دوران اس کی سیکریٹری کمرے میں داخل ہوئی اور دو فائلوں پر اس کے دستخط کرانے کے بعد خاموشی سے باہر چلی گئی۔

تیسرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھا کر اپنی گرجدار آواز میں کہا۔ "میں سیٹھ الیاس بول رہا ہوں۔"

"سیٹھ الیاس۔" دوسری طرف سے کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری بات غور سے سنو۔ میں تمہیں ایک بے حد ضروری اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"جلدی بولو بابا۔" سیٹھ الیاس نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔ "میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

"اطلاع یہ ہے کہ تمہارے دونوں بیٹوں کو ہم نے اغوا کرلیا ہے۔ کلیم اور فہیم اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں۔"

"کیا بکواس ہے؟" سیٹھ الیاس نے کہا۔ "کون ہو تم؟"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "یہ بکواس نہیں ہے سیٹھ الیاس تھوڑی دیر میں تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ تمہارے دونوں بیٹوں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ انہیں ہم نے شہر سے باہر ایک خفیہ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اب اگر تم انہیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ہمیں رات نو بجے تک تیس کروڑ روپے پہنچا دو۔ اگر ہمیں رات نو بجے تک تیس کروڑ روپے نہ ملے تو ہم تمہارے بچوں کو قتل کردیں گے اور....."

"ایک منٹ۔ ایک منٹ۔" سیٹھ الیاس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ "میری بات سنو۔ میرے بچے کہاں ہیں؟ انہیں تم نے کیوں اغوا کیا ہے؟ کیا دشمنی ہے مجھ سے تمہاری؟"

"فضول اور بے مقصد سوالات نہ کرو۔" ریسیور سے آواز آئی۔ "ایک بات اور غور سے سن لو۔ اگر تم نے پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دینے کی کوشش کی تو پھر تم کلیم اور فہیم کو زندگی بھر کبھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ ہمارے آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تم نے کوئی بے وقوفی کرنے کی کوشش کی تو تمہارے بچے زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ رات نو بجے تک تیس کروڑ روپوں کا بندوبست کرلو۔ رقم کہاں پہنچانی ہے، کیسے پہنچانی ہے، اس کے لئے ہم شام کو تمہارے گھر پر ٹیلیفون کریں گے۔ سمجھ گئے۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

"ہیلو۔" سیٹھ الیاس ریسیور میں چیختا رہا۔ "ہیلو۔ میری بات تو سنو..... خدا کے واسطے۔ ہیلو ..... ہیلو....."

مگر دوسری طرف کوئی آواز نہیں تھی۔

سیٹھ الیاس نے ریسیور پٹخ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر پسینہ نمودار ہوگیا تھا۔

کسی سے کوئی بات کئے بغیر وہ دفتر سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور نے اسے باہر نکلتے دیکھا تو بھاگتا

ہوا آیا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔

سیٹھ الیاس نے کار میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا۔ "بچوں کے اسکول چلو۔ فوراً۔"

چند ہی منٹ بعد وہ اسکول پہنچ گیا۔

وہاں چھٹی ہو چکی تھی۔ زیادہ تر بچے گھروں کو جا چکے تھے۔ اسکول کے گیٹ کے قریب ہی سیٹھ الیاس کی دوسری کار کھڑی تھی اور ایک ڈرائیور پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

سیٹھ الیاس کو دیکھ کر دوسرا ڈرائیور تیزی سے اس کے پاس آیا۔

"بچے کہاں ہیں؟" سیٹھ الیاس نے پوچھا۔

"پتا نہیں صاحب۔" ڈرائیور نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "روز تو دونوں سیدھے آکر کار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آج پتا نہیں، وہ دوسرے بچوں کے ساتھ نکل گئے یا کیا ہوا۔ میں تو یہاں گاڑی میں بیٹھا انتظار ہی کر رہا ہوں۔ آپ پریشان کیوں نظر آرہے ہیں صاحب؟"

سیٹھ الیاس نے کہا۔ "نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم گاڑی لے کر گھر چلے جاؤ۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

دوسرا ڈرائیور، دوسری گاڑی لے کر گھر روانہ ہو گیا۔

سیٹھ الیاس نے گاڑی سے اتر کر اسکول کا رخ کیا۔

گیٹ کے قریب ہی دو لڑکے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے سیٹھ الیاس کو دیکھا تو تیزی سے سلام کر ڈالا۔

"وعلیکم السلام۔" سیٹھ الیاس نے کہا۔ "تم مجھے جانتے ہو؟"

ان میں سے ایک لڑکے نے کہا۔ "آپ کلیم اور فہیم کے والد ہیں نا۔ سیٹھ الیاس۔ آپ کو کون نہیں جانتا سیٹھ صاحب۔ میں شہریار ہوں اور یہ سرفراز ہے۔ ہم دونوں اسی اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

"کلیم اور فہیم کو دیکھا ہے تم نے؟" سیٹھ الیاس نے بے قراری سے پوچھا۔

"کلیم اور فہیم!" سرفراز نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو آج دو آدمیوں کے ساتھ گئے تھے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے لوگ تھے۔ ایک کالے رنگ کی کار میں آئے تھے۔"

سیٹھ الیاس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"کیا ہوا سیٹھ صاحب؟" شہریار نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"کچھ نہیں۔" سیٹھ الیاس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "کچھ نہیں ہوا۔"

"ہمیں بتائیے سیٹھ صاحب۔" سرفراز بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کے کام آسکیں۔"

سیٹھ الیاس نے اپنے سامنے کھڑے دونوں پُراعتماد لڑکوں کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "کلیم اور فہیم کو کسی نے اغواء کرلیا ہے۔"

"اغواء کرلیا ہے؟" شہریار نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" سیٹھ الیاس نے کہا۔ "اغوا کرنے والوں نے مجھے فون کرکے بتایا ہے کہ کلیم اور فہیم ان کے قبضے میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج رات نو بجے تک انہیں تیس کروڑ روپے ادا نہ کیے گئے تو وہ کلیم اور فہیم کو مار ڈالیں گے۔"

شہریار نے کہا۔ "آپ نے پولیس کو اطلاع کی؟"

"نہیں۔" سیٹھ الیاس نے کہا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ اگر پولیس کو اطلاع کی گئی تو پھر کلیم اور فہیم مجھے کبھی نہیں مل سکیں گے۔"

"پریشان مت ہوں سیٹھ صاحب۔" سرفراز نے کہا۔ "یہ بتایئے، اغوا کرنے والوں نے کیا کہا ہے؟ وہ تیس کروڑ روپے مانگ رہے ہیں تو یہ رقم انہیں کیسے دی جائے گی؟"

سیٹھ الیاس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے بکھرے بال سنوارے اور کہا۔ "وہ..... وہ شام کو گھر فون کریں گے اور بتائیں گے کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے..... خدایا ..... یہ کیا ہوگیا ہے۔"

"گھبرایئے نہیں۔" شہریار نے کہا۔ "چلئے آپ کے گھر چلتے ہیں فکر مت کیجئے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

سیٹھ الیاس نے سرہلایا اور ان دونوں لڑکوں کے ساتھ واپس کار میں جا بیٹھا۔

کار مڑی اور سیٹھ الیاس کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆ --- ☆ --- ☆

سیٹھ الیاس کے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر شہریار اور سرفراز بیٹھے تھے۔ دور ٹیلیفون کے پاس آرام دہ کرسی پر سیٹھ الیاس پریشان بیٹھا تھا اور اس کے قریب ہی ایک صوفے پر سیٹھ الیاس کی بیوی، جسے سب لوگ بیگم صاحبہ کہتے تھے، دوپٹہ منہ پر رکھے خاموشی سے رو رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔" سیٹھ الیاس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "آخر کسی کو مجھ سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟"

بیگم صاحبہ نے منہ سے دوپٹہ ہٹایا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "تمہاری سمجھ میں کبھی کچھ نہیں آتا۔ ارے، انہیں پیسوں کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے میرے بچے۔" انہوں نے پھر رونا شروع کردیا۔

"بیگم صاحبہ۔" سرفراز نے کہا۔ "خدا کے واسطے رونا بند کر دیجئے۔ سیٹھ صاحب کو سوچنے دیجئے کہ آخر کسی نے کلیم اور فہیم کو کیوں اغوا کیا ہو گا؟ کون لوگ ہو سکتے ہیں وہ؟"

شہریار نے کہا۔ "سوچنے کی کیا بات ہے۔ بیگم صاحبہ نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ انہیں پیسوں کے لئے اغواء کیا گیا ہے۔"

"مگر بھائی شہریار۔ صرف کلیم اور فہیم کو ہی کیوں اغواء کیا گیا ہے" اسکول میں تو سینکڑوں بچے ہیں۔"

"یار سرفراز۔ تم بھی نرے گھامڑ ہو۔ بھئی، باقی سینکڑوں بچے تو عام بچے ہیں۔"

"تو کلیم اور فہیم میں کیا خوبی ہے؟"

"خوبی یہ ہے کہ وہ سیٹھ الیاس کے بچے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اسی سے تو فرق پڑتا ہے۔" شہریار نے کہا۔ "بھئی ایک عام بچے کو اگر اغواء کیا جاتا اور اس کے والدین سے تیس کروڑ روپے مانگے جاتے تو کیا ہوتا؟"

سرفراز نے سوچ کر کہا۔ "کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان عام بچوں کے غریب والدین تیس کروڑ تو کیا، تیس ہزار روپے بھی نہیں دے سکتے تھے۔"

سیٹھ الیاس اور بیگم صاحبہ حیرت سے ان دونوں لڑکوں کی گفتگو سن رہے تھے۔

شہریار نے کہا۔ "بس، اسی لئے اغوا کرنے والوں نے کلیم اور فہیم کو اغوا کیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انہی بچوں کا باپ اپنے بچے حاصل کرنے کے لئے تیس کروڑ روپے دے دے گا۔"

سرفراز نے پوچھا۔ "مگر اغواء کرنے والوں کو کیسے پتا چلا کہ کلیم اور فہیم کسی دولت مند گھرانے کے لڑکے ہیں۔" "یہ تو سارے اسکول کو معلوم ہے۔" شہریار نے کہا۔ "کلیم اور فہیم تو اسکول کے وہ لڑکے ہیں جو ہر روز اپنے گھر سے جیب خرچ کے لئے ایک ایک سو روپے لے کر آتے ہیں۔ وہ پیسٹریاں کھاتے ہیں۔ بوتلیں پیتے ہیں۔ آئس کریم خریدتے ہیں۔ دوستوں کو کھلاتے ہیں خود کھاتے ہیں، انہیں پیسے خرچ کرتا دیکھ کر کوئی اندھا بھی بتا سکتا ہے کہ یہ کسی بے حد امیر باپ کی اولاد ہیں۔"

سرفراز بولا۔ "بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو شہریار۔ مگر ایک سو روپے جیب خرچ لے کر آنا تو ایسی بات نہیں ہے کہ کسی کو اغوا کر لیا جائے۔"

شہریار نے کہا۔ "تم غلط کہہ رہے ہو۔ ایک سو روپے روز کا جیب خرچ دولت کی نمائش ہے۔ دولت کی نمائش کرنے کے بہت سے

نقصانات ہوتے ہیں۔ اسلام نے اسی لئے دولت کی نمائش سے منع کیا ہے۔"

سیٹھ الیاس اور بیگم صاحبہ حیرت سے منہ کھولے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

شہریار بولتا جارہا تھا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے سرفراز۔ اس دولت کی نمائش سے غریب بچوں کے دل پر کیا گزرتی ہے، جو کلیم اور فہیم کی طرح اندھا دھند پیسے خرچ نہیں کرسکتے، انہیں محرومی کا کیسا دکھ ہوتا ہے اور اب اس دولت کی نمائش کا اس سے بڑا کیا نقصان ہوگا کہ کلیم اور فہیم کو اغوا کرلیا گیا ہے۔"

کمرے میں خاموشی چھاگئی۔

کچھ دیر بعد سیٹھ الیاس نے کہا۔ "شہریار تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے ..... میں نے کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "میں تمہیں ہمیشہ منع کرتی تھی کہ بچوں کو مت بگاڑو۔ انہیں اتنے پیسے مت دو۔ وہ اسکول پڑھنے لکھنے کے لئے جاتے ہیں۔ خریداری کرنے نہیں جاتے۔ مگر تمہاری سمجھ میں بات کبھی نہیں آتی۔ آج ..... آج ان بچوں کی باتیں سن کر تمہاری آنکھیں کھلی ہیں۔ مگر اب کیا فائدہ ....." انہوں نے پھر رونا شروع کردیا۔ اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

وہ سب اچھل پڑے۔

سیٹھ الیاس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "ہیلو ..... ہیلو ..... کون بول رہا ہے؟ کلیم .... بیٹا تم کہاں ہو۔ کہاں سے بول رہے ہو ..... کیا؟ ..... کیا کہا .....؟ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے آنے والی آواز سنتا رہا۔ پھر وہ بولا۔ "کتنی دیر میں گھر پہنچو گے؟ ..... ایک گھنٹے میں ..... اچھا ٹھیک ہے جلدی پہنچو۔ ہم سب یہاں تمہارے لئے بے حد پریشان بیٹھے ہیں اچھا خدا حافظ ....." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" بیگم صاحب نے چلا کر پوچھا۔

"کہاں ہیں میرے بچے ..... بتاؤ۔"

"سب خیریت ہے۔" سیٹھ الیاس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "کلیم اور فہیم اپنے اسکول کے دو دوستوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ ان دوستوں نے کسی غار میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے۔ وہ ہیڈ کوارٹر دیکھنے چلے گئے تھے۔ کوئی ضیاء اور شہزاد نام کے دوست ہیں۔ کلیم اور فہیم کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"مبارک ہو سیٹھ صاحب۔" شہریار اٹھ کھڑا ہوا۔ "بیگم صاحبہ، آپ کو بھی مبارک ہو۔

خدا نے آپ کو ایک بہت بڑی پریشانی سے بچالیا ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

انہوں نے سیٹھ الیاس سے ہاتھ ملایا' بیگم صاحبہ نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور وہ رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد جب سیٹھ الیاس اور بیگم صاحبہ اپنے بچوں کی آمد کا انتظار کررہے تھے' سیٹھ الیاس کو اچانک ایک خیال آیا۔

"بیگم۔" سیٹھ الیاس نے کہا۔ "ان لڑکوں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے کلیم اور فہیم کو موٹی موٹی مونچھوں والے دوآدمیوں کے ساتھ جاتے دیکھا ہے۔ کسی کالے رنگ کی کار میں۔"

بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا۔ "اچھا! مگر تم نے تو بتایا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گئے تھے!" سیٹھ الیاس کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کندھے اچکا کر کہا۔ "پتا نہیں' ہوسکتا ہے ان لڑکوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ مگر خیر ان لڑکوں کی باتیں تو جیسے میرے دل میں اتر گئی ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "کسی کی باتیں تو تمہارے دل میں اتریں۔ اب تم یہاں بیٹھے رہو۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے دو رکعت نماز پڑھنے جارہی ہوں۔"

"ضرور پڑھو بیگم۔" سیٹھ الیاس نے کہا۔ "مگر ایک بات میری بھی سنتی جاؤ یہ بات نہیں حکم ہے۔ کل سے کلیم اور فہیم کا جیب خرچ بند۔ باورچی ہر روز ان کے لئے کھانا تیار کرے گا اور وہ اپنے ساتھ لنچ بکس لے کر جایا کریں گے۔ جیسے اسکول کے سارے بچے لاتے ہیں۔"

"خدایا۔" بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا۔ "آج تو کیسی ناقابل یقین باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔" پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆ --- ☆ --- ☆

ہیڈ کوارٹر میں وہ چاروں جمع تھے۔

"ساتھیو!" شہریار نے کہا۔ "آج ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ دیکھنے میں بہت چھوٹی سی لگتی ہے مگر دراصل یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ آج ہم نے ایک دولت مند کو احساس دلایا ہے کہ دولت کی نمائش گناہ ہے۔ ہم نے ایک امیر گھرانے کو یہ پیغام پہنچایا ہے کہ دولت' نقصان بھی پہنچاسکتی ہے۔ ہم نے صرف ایک دو گھنٹے کے لئے کلیم اور فہیم کو کسی بہانے سے ہیڈ کوارٹر میں روک لیا اور ٹیلیفون پر سیٹھ الیاس کو دھمکی دے دی کہ کلیم اور فہیم کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ جو بات سیدھے سادے طریقے سے سیٹھ الیاس کو نہیں سمجھائی جاسکتی تھی' وہ ہماری اس ذرا سی

کارروائی کے بعد اس کی سمجھ میں آسانی سے آگئی۔"

"ہاں" سرفراز نے کہا۔ "اور اتنی اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ شاید سیٹھ الیاس کے لئے زندگی بھر اسے بھولنا ممکن نہیں ہوگا۔"

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔

پھر شہریار نے پوری قوت سے کہا۔ "حق اسکواڈ۔"

"زندہ باد۔" ان چاروں کے نعرے کی گونج دور تک سنائی دی۔

●●●

خالی جگہ

پچھلی صدی کے اخبار بے شک اردو میں نہیں اردوئے معلّٰی میں ہوتے تھے۔ نئے زمانے کی آپا دھاپی نے زبان کا لطف غارت کردیا ہے۔ پرانے دفتروں کا ماحول بھی بہت پُرسکون ہوتا تھا۔ کاتب بیٹھا لکھ رہا ہے۔ ایڈیٹر کو آواز دی۔ "حضور' پاؤ کالم رہ گیا ہے' اس کے لئے میٹر دے دیجئے۔"

ایڈیٹر پکارتا ہے "لکھو آج چوک میں دو ٹانگوں کی ٹکر ہوگئی' تین آدمی زخمی ہوگئے' ایک کی حالت خراب ہے' آگے خود بڑھالو۔"

تھوڑی دیر بعد کاتب پھر پکارتا ہے "حضور دو تین سطریں پھر بھی خالی بچتی ہیں۔"

ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں "اچھا' ان میں خبر کی تردید دے دو کہ ہم نے تحقیق کی' یہ خبر سراسر غلط ثابت ہوئی۔"

(ابن انشاء کے کالم سے اقتباس)

سائرہ سعید' کراچی

نام میرے نام

کامونکی سے محسن عزیز نے خط بھیجا ہے' اس خط کا سائز ہے دو انچ لمبا اور ڈھائی انچ چوڑا۔ سرخ رنگ سے لکھے ہوئے اس خط میں محسن عزیز لکھتے ہیں۔"انکل مجھے ایک سائیکل بھیج دیں اچھی اور خوبصورت گیئروں والی۔ "Mountain Bike" اس کے ساتھ ہی آنکھ مچولی کے سالانہ خریداری کا کوپن ہے۔ جس پر لکھا ہے "آنکھ مچولی میل سے بھیج دیں' پیسے کچھ بھی نہیں۔" اور آخر میں ایک سطر میں لکھا ہے "انکل پلیز بھیج دیں نا' مجھے بہت شوق ہے۔"

ہمیں یہ خط پڑھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی' اس لئے کہ اس خط کے ساتھ ہی محسن عزیز کی ایک پیاری سی تصویر بھی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محسن عزیز کی عمر پانچ یا چھ برس سے زیادہ نہیں۔ اتنی چھوٹی عمر کے کسی بچے کا آنکھ مچولی پڑھنا' اس میں دلچسپی لینا اور پھر خط لکھنا اپنی جگہ خود ایک ایسی بات ہے۔ جس پر ہم محسن عزیز کے شکر گزار ہیں۔ محسن میاں بغیر کسی وجہ کے سائیکلیں بھجواتے رہنا ہماری پالیسی نہیں۔ آپ خود سوچیں نا سائیکل کتنی مہنگی ہوتی ہے۔ اگر ہم سائیکلیں خرید خرید کر پڑھنے والوں کو بھجواتے رہیں تو خود ہماری اپنی سائیکل پنکچر ہو کر رہ جائے گی۔ ہاں البتہ آپ سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کبھی کراچی آئے تو ہم آپ کو اپنی سائیکل پر بٹھا کر خوب سیر کروائیں گے۔

نارتھ کراچی سے صائمہ محمد یاسین نے لکھا ہے۔"ہمارا خیال تھا آنکھ مچولی موٹا تازہ ہو گا مگر یہ تو دبلا پتلا نکلا' ویسے واقعی دریا کوزے میں بند تھا۔ مزہ آیا۔ جب آنکھ مچولی آیا تو میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا مگر جب رنگین صفحہ کے اس قطعہ پر نظر پڑی کہ "زندگی کا ہر لمحہ جہد سے عبارت ہو" تو یہ پڑھتے ہی مجھے جوش آگیا اور میں نے اپنے وہ کام جو التواء میں پڑے ہوئے تھے۔ منٹوں میں ختم کر لیئے۔ صائمہ نے آنکھ مچولی کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "آپ کو تحریر دیکھ کر لکھنے والے کی کلاس کا اندازہ ہو جاتا ہے' اچھی میری تحریر دیکھ کر بتایئے کہ میں کس کلاس میں ہوں۔"

○ صائمہ! پہلے تو خط کا شکریہ' آنکھ مچولی دبلا پتلا تھا۔ آج کل سبھی ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ دبلا پتلا رہنے میں عافیت ہے۔ آنکھ مچولی موٹا تازہ ہو جاتا تو قیمت بھی بھاری بھرکم ہو جاتی۔ قیمت بڑھتی تو نہ جانے کتنے پڑھنے والے اسے خرید ہی نہ پاتے۔ اس لئے اس کا دبلا پتلا رہنا ہی بہتر ہے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے اس میں ۱۶ صفحات زائد تھے۔ ایک تحفہ شامل تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت سی ایسی تحریریں شامل تھیں جو کام چور سے کام چور کو بھی جدوجہد پر اکساتی تھیں۔ جیسا کہ ایک قطعہ پڑھ کر آپ اچھل گئیں۔ ہیں نا۔ آپ کی تحریر دیکھ کر اگر ہم نے بتادیا کہ آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں تو دوسرے پڑھنے والے خوامخواہ یہ سمجھیں گے کہ آپ کی رائٹنگ کتنی خراب ہے۔ ویسے یہ بات تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے چوتھی جماعت تو کسی نہ کسی طرح پاس کر ہی لی ہوگی۔ صائمہ خط لکھتے ہوئے "از طرف" نہ لکھا کریں از کے معنی ہی "منجانب" کے ہیں اور اگر "از" بھی نہ لکھیں تب بھی پتہ تو چل ہی جاتا ہے کہ خط کس نے اور کہاں سے لکھا۔ خط لکھنے کا بے حد شکریہ۔

حافظ عبداللہ انور' چونیاں ضلع قصور سے لکھتے ہیں "اتنا بہترین رسالہ شائع کرنے پر مبارکباد نہ دینا کم ظرفی ہوگی لہٰذا مبارکباد۔ حافظ صاحب نے رسالے کی تعریف کی ہے۔ کمانیوں پر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں ایک تجویز دی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ہر بار کوئی نئی بات یا نیا شعر شائع کیا کریں۔

○ عبداللہ انور صاحب! مبارکباد اور تجاویز کا شکریہ' ہر بار آنکھ مچولی میں ۸۰ سے ۹۰ فیصد مواد نیا ہوتا ہے۔ رہ گئی شعر کی بات تو بلاوجہ شعر شائع نہیں کیا جاسکتا' نظمیں' غزلیں تو چھپ ہی جاتی ہیں۔ اشعار کے حوالے سے کوئی نیا آئیڈیا ہو تو لکھ بھیجیں ہم آپ کے بھجوائے ہوئے آئیڈیے کو من و عن اشعار کے ساتھ شائع کردیں گے۔ معیار شرط ہے حافظ صاحب آپ کی رائٹنگ اتنی اچھی کیسے ہوئی؟ یہ راز ہمیں بھی بتایئے۔

بنجگور سے عقیل شانہ عیسیٰ ایک بار پھر اپنے خوبصورت خط کے ساتھ حاضر ہیں۔ اس بار انہوں نے اپنے آپ کو "کمترین" لکھا ہے جو ہمیں پسند نہیں۔ عقیل!

آپ تو "بہترین" ہیں پھر "کمترین" کیوں لکھتے ہیں۔ عقیل عیسیٰ لکھتے ہیں۔ "چمکتا دمکتا ملا جب رسالہ' کھل اٹھا میرا دل جیسے گل لالہ" امید ہے آئندہ بھی آنکھ مچولی مسرت کے گُل کھلا کر ہماری سانسوں کو معطر کرتا رہے گا۔" عقیل عیسیٰ صاحب آنکھ مچولی اور ٹوتھ پیسٹ میں کچھ تو فرق کیجئے۔ آنکھ مچولی دل و دماغ کو تو مسحور کر سکتا ہے مگر سانسوں کو معطر رکھنے کے لئے تو کوئی ڈینٹل کریم ہی لینا ہوگی۔ آپ کا خط خوبصورت تھا۔ ان محبتوں پر بے حد شکریہ۔

فوزیہ علوی نے پٹارو سے خط لکھتے ہوئے نئے سال کی مناسبت سے ایک شعر لکھا ہے'

اے دوست فراموش تیرا ہوش کہاں ہے آنے کو ہے نیا سال تیرا تحفہ کہاں ہے

فوزیہ تحفہ تو جنوری کے خاص نمبر کے ساتھ ہم نے بھجوادیا۔ امید ہے پسند بھی آیا ہوگا۔ فوزیہ نے یہ خط مقابلہ پڑھنے سے قبل تحریر کیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے ہم سے بہت سی توقعات بھی وابستہ کر رکھی تھیں۔ خدا کرے ہم ان کی توقعات پر پورے اترے ہوں۔ فوزیہ خاص نمبر پر آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

طارق ریاض خان' لاہور سے مخاطب ہیں' انہوں نے مقابلہ نمبر کو پسند کیا ہے۔ تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور جن لوگوں کی تحریروں نے انہیں متاثر کیا ان کے نام بھی فرداً فرداً گنوائے ہیں۔ انہوں نے "سائنس نمبر" نکالنے کی تجویز بھی دی ہے۔ طارق ریاض صاحب آپ نے جس انداز سے آنکھ مچولی کا جائزہ لیا ہے سچ بات یہ ہے کہ ہمارا دل موہ لیا۔ آنکھ مچولی سے آپ کی محبت دراصل علم و ادب سے آپ کی محبت کی ایک صورت ہے۔ اپنے پسندیدہ رائیٹرز کی فہرست میں آپ نے یہ جو اس خاکسار کا نام بھی لے ڈالا تو کہیں یہ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر تو نہیں ہوگیا۔ اس لئے کہ میرے لکھے ہوئے قصہ کوئیز کو اسی ماہ اکثر پڑھنے والوں نے مشکل کہا ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ اب قصہ کوئیز ختم کرکے کچھ اور شروع کروں مگر آپ کے خط نے تھوڑی سی ڈھارس بندھادی۔ طارق صاحب حوصلہ افزائی کا شکریہ۔

فائزہ ہاشمی نے کراچی سے جو خط ہمیں لکھا ہے' اگر اس خط کو آنکھیں مل جائیں تو یہ ہمیں قہر آلود ہو کر گھورنے لگیں' زبان مل جائے تو ہمارے خلاف گویا ہو جائے اور اگر اس خط کو ناخن مل جائیں تو وہ ہمیں ہی نوچ ڈالیں توبہ توبہ اتنا غصہ' آپ بھی اس خط کو پڑھیے' لکھتی ہیں۔ "میں اتنی سخت ناراض ہوں کہ آئندہ آنکھ مچولی خریدوں گی ہی نہیں۔ خریدوں بھی کیوں؟ ہم پاگل ہیں کیا جو صفحے بھرتے چلے جائیں۔ بتائیے کیا ہماری "انک" فالتو ہے' کیا ہمارا کاغذ بے کار ہے اور آپ کا کاغذ بڑا مہنگا۔ آنکھ مچولی والے بہت خراب ہیں۔ انہیں بچوں کے جذبات کی قدر ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے آنسو بے کار ہیں۔ میں نے آپ لوگوں کو جان بوجھ کر تڑیاں دی ہیں اس لئے کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ جو لوگ تڑیاں لگاتے ہیں ان کے خط اور تحریریں شائع ہو جاتی ہیں۔"

○ فائزہ ہاشمی یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو کیا ہوگیا۔ اگر امی نے آپ کو ڈانٹ بھی دیا تھا تو اس کا غصہ ہم پر کیوں اتار دیا۔ امی ابو تو غلطیوں پر ڈانٹ ہی دیتے ہیں۔ آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا ہم اکثر ڈانٹنے والوں کے خط شائع کردیتے ہیں۔ اب دیکھئے ناں آپ کا خط بھی تو شائع ہو ہی گیا۔ تڑیاں لگنے کے بعد خط شائع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کون ہوگا جسے اپنی جان اور عزت عزیز نہ ہو۔ ویسے ایک بات بتائیں یہ جو اکثر جدون ادیب، علی جبران، اخلاق احمد، نگہت آراء اور ایسے بہت سے لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں تو ان سے ہماری کوئی رشتے داری تو ہے نہیں۔ نہ ہی یہ لوگ ہمیں ڈانٹتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ اچھا لکھتے ہیں اس لئے آئے دنوں ان کی تحریریں رسائل کی زینت بنتی ہیں بلکہ ہم ان کی منت سماجت کرتے ہیں کہ پلیز ہمارے لئے بھی لکھیے۔ امید ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ اب غصے کا بھوت سر سے اتاریئے اور فوراً" کچن میں جاکر امی کا ہاتھ بٹایئے ورنہ پھر ڈانٹ پڑجائے گی اور پھر ہماری شامت آجائے گی۔

بنت عفت ضیاء نے اپنے خط کی ابتداء اس شعر سے کی ہے ؎

اپنے ملک کا ہر شہر، ہر نگر ہمیں اپنی جان سے پیارا ہے
سوہنا پاکستان ہمارا ہے، پیارا پاکستان ہمارا ہے

بنت عفت ضیاء آپ کا خوبصورت خط اور تحریر مل گئی۔ جوابی لفافہ کھو گیا لہٰذا اسی خط کو جوابی خط تصور کیجئے۔ آپ کی تحریر پر اب تک فیصلہ نہیں ہوا، پلیز انتظار کیجئے۔ آپ کا شعر شائع ہوگیا۔ اگر یہ شعر آپ کا اپنا ہے تو پھر تو بہت ہی لاجواب ہے۔ اللہ تعالیٰ ملک و ملت اور اس کے کوچہ و بازار سے ہمارا تعلق آپ کے شعر کی صورت میں قائم رکھے۔ آمین۔

محمد اکبر رشید بھٹی صاحب آپ کے دعائیہ خط کا شکریہ۔ آپ کی کہانی شائع نہ ہوسکنے پر دلی معذرت۔ آمنہ طارق، راولپنڈی ہمارے پاس شاہد آفریدی کا پوسٹل ایڈریس نہیں ہے البتہ اگر آپ، شاہد آفریدی معرفت آنکھ مچولی لکھ کر خط بھجوادیں تو ہم یہ خط انہیں بھجوادیں گے۔

محمد عثمان خان، پشاور اپنی تحریر کی اشاعت پر اس قدر خوش ہیں۔ یہ خوشی فطری ہے جو ہر مقابلے میں کامیابی پر ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی ایسی بہت سی کامیابیاں عطا کرے۔

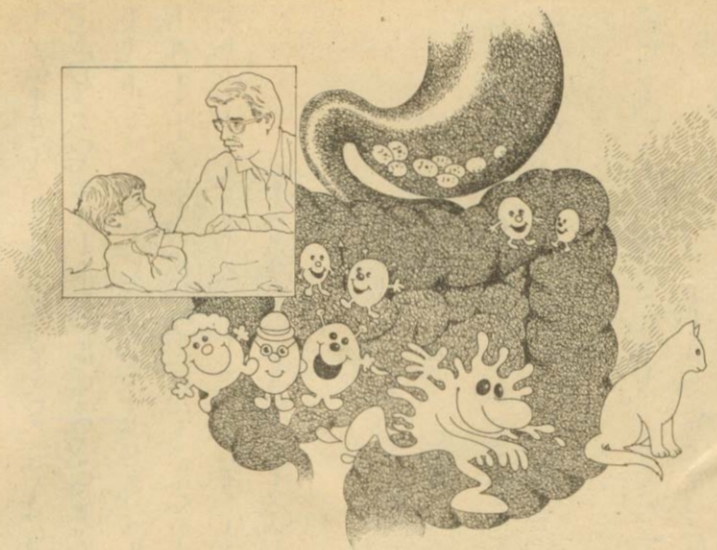

دوسری فتح

ادیبہ ناز

"این" اور "ایکسن" دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کی زندگی بڑی شان سے گزر رہی تھی۔ وہ دونوں بیکٹیریا تھے اور ان کی جائے پیدائش نرم نرم بلیوں کی نرم نرم آنتیں تھیں۔

جب بھی وہ اپنے نئے "گھر" میں آتے تھے۔ اس کے چند گھنٹوں بعد اس بلی کو ہاضمے کی خرابی محسوس ہوتی تھی' اور پھر اسے چوہے کی شکل سے بھی قے آنے لگتی تھی۔ اگلے دن اسے بخار چڑھنا شروع ہوتا تھا' جو بڑھتا جاتا تھا۔ یہ وقت این اور ایکس کی "شفٹنگ" کا ہوتا تھا' کیونکہ اب وہ گھر بوسیدہ ہوچکا ہوتا تھا۔

اب ماشاء اللہ ان کے چار بچے تھے۔ اس دوران وہ ایک نئے گھر میں منتقل ہوئے' جہاں پہلے سے ان کی نسل کی ایک اور فیملی آباد تھی۔ این کی بڑی بیٹی "زی" کی شادی دوسری فیملی کے "وائے" سے ہوگئی۔

"کیوں نہ اس مرتبہ ہم کسی امیر گھر کی موٹی تازی بلی کے اندر اپنا "محل" بنائیں۔ خیر سے اب ہمارا خاندان بڑھ رہا ہے۔" دونوں خاندانوں کے ایک بڑے نے تجویز پیش کی، جو سب نے پسند کی۔

لیکن انہیں اس پالتو بلی کے ہاں کا ماحول پسند نہ آیا۔ یہ بلی عجیب کھانے کھاتی تھی۔ کبھی گرما گرم چائے اندر آتی اور ان کے محل کی دیواریں تپ جاتیں، کبھی روسٹ مرغ، جس کی تیز مرچیں ان کی آنکھوں میں جلن پیدا کردیتیں اور کبھی ملک شیک جس کی "بُو" سے ان کے دماغ بھر جاتے۔

ایک دن بچے باہر کھیلتے کھیلتے بہت دور نکل گئے، جہاں انہیں ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔ یہ بلی ایک اور مخلوق کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی، جو اسے ملک شیک پلا رہی تھی۔ پلانے کے بعد اس مخلوق نے ہاتھوں سے بلی کی مونچھیں صاف کیں اور اس کا برتن دھو کر رکھا۔

بچوں نے گھر جاکر سارا ماجرا اپنے والدین کو کہہ سنایا۔ رات کے کھانے پر صلاح مشورہ ہوا۔

"کیوں نہ اس مصیبت زدہ ماحول سے نکلیں، بچے روز آنکھوں میں خارش کرتے ہیں اور اپنا بھی گرمی سے دم گھٹتا ہے۔ کیوں نہ اس دوسری مخلوق میں گھر بنایا جائے۔" ایکس نے مشورہ دیا۔

"مگر یہ تو بہت بڑا "رسک" ہے، ابا جان۔" زی بولی "کون جانے اس مخلوق میں کیسا ماحول ہے۔ اگر اس سے بھی برا ہوا تو!"

"ارے بیٹی، اتنا ڈرتی کیوں ہو؟" اس کی ماں این بولی۔ "تمہارے ابا ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر ماحول اچھا نہ ہوا تو "شفٹ" ہوجائیں گے، واپس یہاں! پھر اب یہاں رہنا بھی تو مشکل ہو رہا ہے۔"

زی کا سسر بولا : "ہاں بہن، میری سمجھ بھی کچھ ایسا ہی کہتی ہے۔ کچھ منہ کا ذائقہ ہی بدل جائے گا!"

چنانچہ اگلے دن سارا خاندان اس بلی کی مونچھوں پر موجود تھا۔ طویل انتظار کے بعد دوسری مخلوق آئی، بلی کو روسٹ کھلایا اور دودھ پلوایا۔ اس دوران یہ سارا خاندان دودھ کے برتن کی دیواروں پر منتقل ہوچکا تھا۔ مخلوق نے برتن کو فوم سے دھویا۔ بیکٹیریوں کو نرم فوم اپنے ساتھ اٹھا تا لے گیا۔

اب وہ حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ صبح سے بھوکے تھے۔

چند گھنٹوں بعد وہی مخلوق آئی اور ایک

پلیٹ اس فوم سے دھونے لگی۔ سب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جھٹ سے پلیٹ میں پہنچ گئے۔ جلد ہی ان پر گرم گرم شوربا پڑا' مگر اس مرتبہ وہ گھبرائے نہیں بلکہ باری باری' شوربے کے ذریعے' اس مخلوق کے اندر اترتے چلے گئے۔

جب تک پورے گروہ نے لینڈ کیا' ان کے بڑے آنتوں کی راہ پا چکے تھے۔

"واہ! یہاں آکر تو وارے نیارے ہوگئے' مزہ آگیا زندگی کا۔"

"کتنا کھلا گھر ہے' کتنا اچھا ماحول ہے۔"

"امی' کتنا مزیدار خون ہے۔" "کمال ہے' ہمیں پہلے خیال کیوں نہ آیا؟" "بیگم یہ تو ہمارا تاریخی کارنامہ ہے' ہماری عظیم فتح ہے' اتنی پائے کی رہائش دریافت کرنا!" میں نے فیصلہ کرلیا ہے' اپنے بچوں کو بھی یہیں سیٹ کروں گی' اب نہیں واپس جانے کی بلیوں میں!"

یہ سب باتیں خاندان کے افراد ایک دوسرے سے کررہے تھے۔

"ارے سنو' اس مخلوق کی آواز بھی میاؤں جیسی نہیں' بلکہ بڑی میٹھی ہے۔"

"امی میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا کھانا کھانے کو۔ کل رات سے میرا پیٹ کچھ خراب ہے۔" وہ مخلوق بول رہی تھی۔

اگلی صبح شور سے سب بیکٹیریوں کی آنکھ کھل گئی۔ مخلوق رو رہی تھی۔ "امی' میرا جسم ٹوٹ رہا ہے' سر میں بہت درد ہے۔" اس کی ماں پریشانی میں اس کا سر اور جسم دبا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب آئے اور موسمی بخار کی دوا لکھ دی۔ دو دن گزر گئے' مگر آرام نہ آیا۔

آخر کار سب سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا گیا' اس نے ہر طرح کے ٹیسٹ کیئے اور کچھ پریشان سا دکھائی دیا۔ سب بڑے بڑے ڈاکٹروں کی میٹنگ ہوئی۔

"یہ جرثومہ میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔"

وہ ڈاکٹر بولا "یہ میرا ۴۵ سالہ تجربہ کہتا ہے کہ یہ ضرور کسی دوسری مخلوق سے انسان میں منتقل ہوا ہے۔" دوسرے نے رائے دی۔

"مثلاً؟"

"مثلاً مچھر' مکھی' کتا' بلی وغیرہ۔"

اسی وقت بچے کے گھر فون کیا گیا اور پتہ چل گیا کہ وہاں ایک پالتو بلی موجود ہے۔ اس بلی کو تجربہ گاہ میں لاکر اس کے ٹیسٹ لئے گئے۔ جب چھوٹی آنت کے ایک حصے کو ایک خاص محلول میں ڈالا گیا' تو وہاں بالکل اسی نوعیت کے جرثومے پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ یہ دراصل اس خاندان کے ایک بہت چھوٹے دودھ پیتے بچے کی

وجہ سے پیدا ہوئے تھے جو منتقلی کے دوران بھوک سے مرجانے کی وجہ سے یہاں چھوڑ دیا گیا تھا۔

بہرحال، جرثومے کا بلی سے منتقل ہونا ثابت ہوگیا۔ اس جرثومے کا نام "ایکس بیکٹریم" رکھا گیا۔ سائنس کی زبان میں جس چیز کے بارے میں بہت کم معلومات ہوں، اسے "ایکس" کا نام دیا جاتا ہے۔

ادھر ایکس بیکٹریم کا خاندان محسوس کررہا تھا کہ یہ محل بوسیدہ ہورہا ہے۔ چنانچہ سب بوریا بستر سمیٹ کر ایک اور انسان میں جاگھسے۔ یہ اس گھر کا ملازم نعیم تھا، جو اس بچے کے کپڑے بدلواتا اور بستر دھوتا تھا۔

چند روز میں ملازم بھی بخار میں سدھ پڑا تھا۔ ایسے میں ملک کے ماہرین اور ڈاکٹر حضرات کی ٹیم پر دباؤ مزید بڑھ گیا۔ "کیوں نہ ہم اس جرثومے کا اینٹی بائیوٹک تیار کریں! جیسے ہم نے گزشتہ برسوں میں کئی دوسرے جراثیموں کے بنائے ہیں!" یہ ایک قابل ترین اور تجربہ کار ڈاکٹر تھا "مگر ہم ابھی تک اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتے ہی نہیں، پھر یہ کیوں کر ممکن ہے؟" دوسرے ساتھی نے سوال کیا۔

"ہم بلی کو استعمال کرسکتے ہیں۔ پہلے ہم اس کے جسم میں جرثومہ داخل کریں گے۔ اس کا جسم اس کے خلاف جو "اینٹی باڈی" بنائے گا، اسے ہم حاصل کرلیں گے۔"

جلد ہی تجربہ شروع ہوگیا، اینٹی باڈی حاصل کئے گئے اور ایک بیمار بلی میں انہیں داخل کرنے پر وہ صحت یاب ہوگئی "دراصل یہ جراثیم اتنی تیزی سے بڑھتا ہے کہ جسم کی اپنی اینٹی باڈی اس کا مقابلہ نہیں کرپاتی، ایسے میں اگر باہر سے اسی قسم کی مزید اینٹی باڈی داخل کردی جائیں، تو جراثیم اسی تیزی سے ہلاک ہوجاتے ہیں" یہ اسی ڈاکٹر کی وضاحت تھی جلد ہی طاقتور اینٹی بائیوٹکس تیار ہوگئی۔ پہلا تجربہ اسی ملازم پر ہوا۔

ادھر بیکٹریوں کا خاندان تیزی سے بڑھ رہا تھا، مگر اب تو قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سب سے پہلا اجل نامہ خاندان کے کمزور بوڑھوں کے نام آیا اور رات تک آدھا خاندان موت کی نیند سوچکا تھا۔ زی اور وائے بے چارے اپنے تمام بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ آخر کار زی نے ایک فیصلہ کیا، "کیوں نہ ہم دونوں اس انسان کے منہ تک پہنچ کر وہاں سے فرار ہوجائیں!"

"لیکن اگر راستے میں بھوک سے مرگئے تو!" وائے خوفزدہ تھا۔ "پھر اس طرح بھی تو ہم مر

ہی جائیں گے' میری مانو' ذرا ہمت کرو۔" ابھی دونوں خوراک کی نالی پر تھے کہ ملازم کو شدید قے ہوئی اور وہ ایک ہی جست میں باہر کود گئے۔ "جان بچی سو لاکھوں پائے" کے مصداق ایک بلی میں جا گھسے۔

"مبارک ہو ڈاکٹر رفیع' ہم نے ایکس بیکٹریم کو فتح کرلیا ہے اب یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" یہ مسرت بھری آواز اسی ماہر ڈاکٹر کی تھی' جس نے اینٹی بائیوٹک بنانے کی تجویز اور طریقہ پیش کیا تھا۔

تھوڑی ہی مدت گزری ہوگی کہ زی اور وائے کا نیا بیٹا "ین" جوان ہوچکا تھا اور اپنے والدین سے انسان کی کہانیاں سن سن کر جوشیلا بھی! مگر اس کے والدین نے اسے انسان کے وجود کے قریب پھٹکنے سے بھی سختی سے منع کر رکھا تھا۔

ایک دن وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ کر فرار ہوگیا' گھر والوں کو وہ ایک انسان کے منہ میں جاتا دکھائی دیا..... اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ وہ انسان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ لیکن اپنے پیچھے ایک دل خراش تاریخ چھوڑ گیا۔

اس کی بیٹی "ایل" بھی اپنے باپ جیسی تھی' بہت بہادر ذہین عقلمند اور فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جانے والی۔ اس نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ اپنے باپ کی بے وقت موت کا بدلہ ضرور لے گی۔

چنانچہ ایک روز وہ کسی کو بتائے بغیر' اپنے حفاظتی آلات سے لیس ہو کر چل دی جلد ہی وہ ایک بچے کی چھوٹی آنت میں موجود تھی اور وہاں اپنی فوج تیار کر رہی تھی۔

اسی اثناء میں بچے کو متلی' قے اور بخار کے دور ہوئے' تشخیص ہوگئی اور اب بچے کے ماں باپ وہی اینٹی بائیوٹک "سیرپ" کی شکل میں اسے پلا رہے تھے۔

"اونہوں' یہ تو بے حد کڑوی ہے' میں دوسرا چمچہ نہیں پیوں گا۔" بچہ بڑبڑا رہا تھا۔

"نہیں بیٹے' دو چمچہ پی لو' پھر ٹھیک کیسے ہوگے؟"

اس کی ماں نے منت کی۔

بہت مشکل سے اس نے مان کر دیا۔ دن میں تین مرتبہ یہ خوراک لینی تھی۔ مگر بچہ ناسمجھ تھا' اس لئے اس کی ماں کو نہایت اہتمام سے دوائی پلانی پڑتی تھی۔

ادھر جب پہلی مرتبہ اینٹی بائیوٹک کا حملہ ہوا تو ایل مزے سے سو رہی تھی۔ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دیکھا کہ ایک ہیولا اڑتا ہوا اس کے

ایک بچے کی طرف بڑھ رہا ہے' ایک ساعت میں وہ اس کے جسم میں گھس گیا' بچہ اکڑ گیا اور پھر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

اگلے ہی لمحے ایک ہیولا ایل کی طرف بڑھا۔ اس کی تو روح فنا ہو گئی۔ اس نے دوڑ لگا دی' مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ جب رک کر دیکھا تو وہ ایک اور بچے کے اندر پیوست ہو چکا تھا۔

ان پے در پے حملوں سے وہ بوکھلا گئی۔ "میں کچھ کروں تو کب کروں؟" دھڑا دھڑ کئی ہیولے آ کر اپنا کام کر گئے۔

اس رات کو بچے کے امی ابو کو ایک دعوت پر جانا تھا۔ ماں کے بغیر بچے کی نیت بگڑ گئی۔ "اب تو بخار بھی کافی اتر چکا ہے' کیوں نہ ابھی کی خوراک چھوڑ دوں۔" اس نے خود سے کہا' اور مزے سے سو گیا۔

ایل بیچاری' جو مسلسل حملوں سے جان بچاتی پھر رہی تھی' نے محسوس کیا کہ اب حملوں کی رفتار کم ہو گئی ہے۔ وہ اپنے حفاظتی کونے سے باہر نکلی اور ادھر ادھر بکھری لاشوں کا بغور معائنہ کرنے لگی۔

اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان سب کے جسم کی کھالوں کو اس ہیولے نے کمزور کر دیا تھا' جس سے وہ اندر گھس گیا اور کسی طرح سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ یکایک اس کے ذہن نے اسے ایک ترکیب سجھا دی: "اگر میرے جسم پر بہت سے بازو ہوں' تو وہ ہر طرف سے مقابلہ کر کے ہیولے کو قریب ہی نہ آنے دیں۔" یہ سوچ کر اس نے اپنے جسم میں ایک کیمیائی مادہ تیار کیا' جس کی مدد سے اس کی جلد پر بے شمار بازو اگ آئے' جو ہر وقت ہلتے رہتے تھے اور دور سے خطرے کو محسوس کر کے جسم کو ڈھانپ لیتے تھے۔ اس نے اپنے سب بچوں کو بھی یہ تربیت دے دی۔ اب تو سب کی ہیت ہی بدل گئی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور نظر آنے لگے۔

بچہ صبح سو کر اٹھا تو اس کی ماں نے اسے دوائی کی خوراک پلا دی اس کے ساتھ ہی ہیولوں کا ایک غول ایل اور اس کی فوج کی طرف بڑھا۔ مگر افسوس' اس مرتبہ کوئی ہیولا ان کے جسم کے پاس بھی نہ پھٹک سکا اور پھر سب تنگ آ کر آگے بڑھ گئے۔

ایل کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا' اس نے مزید کسی انتظار کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ اپنا "ٹارگٹ" حاصل کر چکی تھی۔

ایل اور اس کے نئے بچے' سب نئے روپ میں' خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے اپنے پرانے' بلی والے' گھر میں داخل ہوئے مگر یہ کیا! دادی

دادا نے تو انہیں پہچانا ہی نہیں۔

"اہو! دادی اماں، دیکھیں تو سہی۔ ہمیں اب کوئی انسان کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم نے انسان پر فتح پالی ہے۔"

دادی بولیں۔

"ہاں بیٹی۔ واقعی اور یہ ہماری دوسری فتح ہے۔ ہماری پہلی فتح وہ تھی جب تمہارے باپ دادا ایلی سے انسان تک پہنچے تھے۔"

"دادی اماں! اب ہم پھر سے انسانوں کی دنیا میں اور مزے مزے کے محلوں میں رہیں گے۔" ایل بولی۔

ایک اور انسان بخار میں شدھ بستر پر پڑا تھا۔ ڈاکٹر اس کے پاس کھڑا، حیران و پریشان، کہہ رہا تھا : "کمال ہے، آج چھٹا دن ہے اور بخار ہے کہ اترنے کا نام نہیں لیتا! یہ تو بڑی "اسٹرانگ (Strong) اینٹی بائیوٹک تھی.....!"

ایک بار پھر ملک کے ماہرین جمع ہوئے۔ ان کا موضوع اب بھی ایکس بیکٹریم تھا۔ مگر اس مرتبہ سب سر پکڑے بیٹھے تھے کہ "ایکس بیکٹریم نے مزاحمت پیدا کرلی ہے اور اب دوسری فتح ہو تو کیونکر ہو؟" ●●●

حیرت انگیز اور دلچسپ

یاسر ملک، ڈڈیل، آزاد کشمیر

۱- کن دو اعداد کا حاصل ضرب اور حاصل تفریق مساوی ہوتا ہے۔

۲- ایک شخص کسی کے گھر تنخواہ پر ملازمت کرتا ہے۔ وہ اپنی تنخواہ پہلے دن ایک پیسہ دوسرے دن اس کا دوگنا یعنی (۲) تیسرے دن اس کا دوگنا یعنی (۴) مقرر کرتا ہے۔ بتایئے ایک ماہ بعد اس کی تنخواہ کیا بنتی ہے؟

جوابات

۱- 19x.95 اور 18.05=19-.95

۲- 536,870,912 روپے

منّے میاں کی عید

محمد علی انصاری

عید پر بیٹا مرا آیا مجھے غمگیں نظر
جانے کیسا بوجھ تھا معصوم قلب و ذہن پر

میں نے پوچھا پاس جاکر اس سے یوں "منے میاں!
اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں آپ آخر کیوں یہاں؟

آج تو ہے عید کا دن، آپ کیوں غمگین ہیں؟
اس طرح بیٹھے ہیں جیسے آپ تو مسکین ہیں"

مسکرائی میں تو وہ رونے لگا منہ موڑ کر
"کیوں گئے ہیں ہم کو ابا جان تنہا چھوڑ کر"

ہچکیاں لیتے ہوئے وہ مجھ سے یہ کہنے لگا
آنسوؤں کا ایک دریا تھا کہ جو بہنے لگا

سن کے بات اس کی مری آنکھوں میں آنسو آگئے
میرے دل پر ایک پل میں غم کے بادل چھاگئے

یہ کہا رو کر پھر "اُن کو اب کہاں میں پاؤں گا
کیا نماز عید پڑھنے میں اکیلا جاؤں گا

ایک پل بھی مجھ کو نہ آئے گا چین اب انکے بِن
عید کے لمحات بھی ڈستے رہیں گے سارا دن

ظالموں نے مار ڈالا میرے ابا جان کو
روند ڈالا اس طرح سے میرے ہر ارمان کو

عید کی خوشیاں مناؤں کیسے اب ان کے بغیر
بعد ابو کے مجھے تو ہر کوئی لگتا ہے غیر

کیوں فضا میں ہر طرف بارود کی پھیلی ہے بُو
کب تلک بہتا رہے گا بے گناہوں کا لہو

حکمراں کب تک الاپیں گے وہی بے سُر کا راگ
عید کے آنے سے کیا بجھ جائے گی نفرت کی آگ

سوچتا ہوں، کیا مجھے بھی اب کبھی بھائے گی عید
راحتیں میرے لئے بھی کیا کبھی لائے گی عید؟"

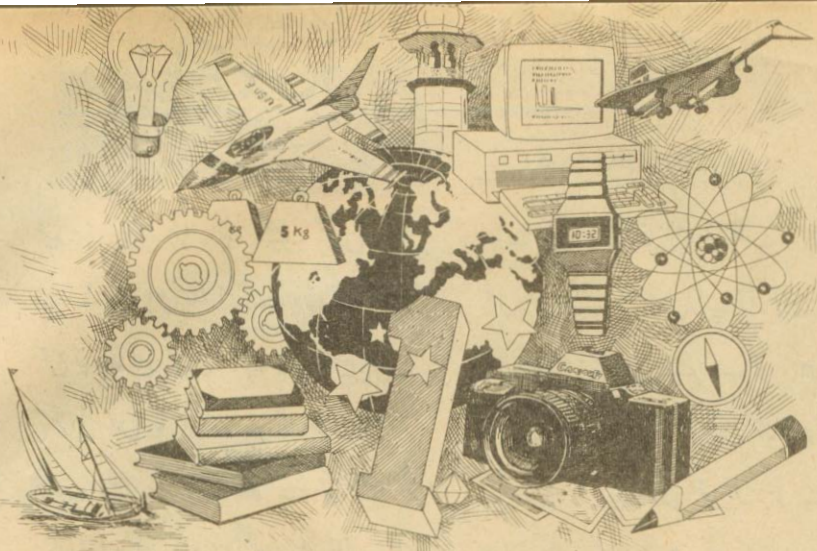

پہلی بار

محمد صابر

کش مکش کی اس دنیا میں ہر خاص و عام کام کسی نہ کسی نے پہلی بار ضرور کیا تھا۔ ایسا کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور کیا کیا ہوا؟ تاریخ کے صفحات سے یہ منفرد اور حیرت انگیز معلومات آنکھ مچولی کے قارئین کی دلچسپی کی نذر ہیں۔

یوری گیگارین کو دنیا کے پہلے خلا باز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ 12 اپریل 1961ء کو سابق سویت یونین کے خلائی جہاز وسٹوک اول کے ذریعے خلاء میں پہنچے جبکہ سابقہ سویت یونین ہی کی ویلنٹینا ٹریشکوا کو دنیا کی پہلی خاتون خلا باز کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ 16 جون سنہ 1963ء کو

خلائی پرواز <Vostok6> کے ذریعے خلا میں بھیجی گئیں۔

Salyut - 1 کو دنیا کا پہلا خلائی اسٹیشن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس خلائی اسٹیشن کی کل لمبائی 47.3 فٹ ہے جبکہ اس کی مجموعی چوڑائی 13.6 فٹ تھی۔ اسے Part 'Docking Compartment اور 'Transfer Work Station Instrument Section میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس خلائی اسٹیشن میں برقی رو کی فراہمی اس میں نصب Solar Panels کے ذریعے ممکن بنائی گئی تھی۔

سابق سویت یونین سے تعلق رکھنے والے خلاء باز Alexi Leonov خلا میں چہل قدمی کرنے والے دنیا کے پہلے خلاباز ہیں جبکہ خواتین میں یہ اعزاز سوویت یونین ہی کی خلاء باز Svetlana Sevitskaya کو حاصل ہے۔

سابق سویت یونین کے خلاء باز Titov Major Ghermon نہ صرف خلاء میں مکمل ایک دن گزارنے والے پہلے خلاء باز ہیں بلکہ وہ خلاء میں قیام کے دوران بیمار ہونے والے پہلے شخص بھی ہیں۔

5 اکتوبر سنہ 1984ء کو خلائی شٹل چیلنجر خلائی مہم پر روانہ ہوئی۔ وہ خلائی پرواز اس وجہ سے زیادہ اہمیت اختیار کرگئی کہ اس میں دو خواتین خلاء باز بھی شامل تھیں جن میں سے ایک Sallyride تھیں جنہیں امریکہ کی پہلی

خاتون خلاباز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ جبکہ دوسری خاتون خلاباز Kathy Sullivan تھیں۔ جو خلاء میں چہل قدمی کا اعزاز حاصل کرنے والی پہلی امریکی خاتون ہیں

چارلس واکر Charles Walker دنیا کے پہلے خلائی مسافر ہیں جنہوں نے باقاعدہ کرایہ ادا کر کے خلاء کا سفر کیا۔ اس سفر کے لئے ان کے ادارے Mr Donnel Douglas نے امریکی خلائی ادارے ناسا کو چالیس ہزار پونڈ کی خطیر رقم ادا کی اور وہ ناسا کی خلائی پرواز 41D STS کے ذریعے 30 اگست سنہ 1984ء کو خلاء میں برقی تجربات کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔

15 جولائی سنہ 1975ء کو امریکہ کی خلائی پرواز Apollo-18 کی روانگی عمل میں آئی۔ اس خلائی پرواز کے ایک رکن Dekeslyton تھے جن کی اس وقت عمر پچاس سال تھی اس طرح وہ پچاس سال کی عمر میں خلائی مہم پر روانہ ہونے والے دنیا کے پہلے خلاء باز قرار پائے۔

سویوز 29 سو دن سے زائد عرصہ خلاء میں گزارنے والی پہلی انسان بردار خلائی پرواز ہے۔ اس خلائی پرواز کے ذریعے دو خلاباز ولادیمیر کو ویلینکو اور الیگزنڈر آوَن چینکو خلاء میں بھیجے گئے۔

سابق سویت یونین کے Feoktistov Boris Yegerov Konstantine خلاء تک رسائی حاصل کرنے والے دنیا کے پہلے سویلین اشخاص ہیں وہ 12 اکتوبر سنہ 1964ء کو خلائی جہاز Voskhod 1 کے ذریعے خلاء میں بھیجے گئے۔ انہیں خلا میں بھیجے جانے والے پہلے ڈاکٹر اور اولین سائنس دانوں کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

13 مئی 1982ء کو سابق سویت یونین کا خلائی جہاز سویوز TS خلاء کو روانہ ہوا۔ اس خلائی پرواز کو اس لحاظ سے انفرادیت حاصل رہی کہ اس مہم کے دوران اس کے خلاء بازوں اناطولی بیرزوئی اور ویلیٹن لیبیڈیو نے خلاء میں 200 دن سے زائد قیام کیا۔ اس طرح خلاء میں 200 دن سے زائد قیام کا یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔

امریکہ کے سینیٹر ایڈون جیک Jake Edwin خلاء کی وسعتوں کو مسخر کرنے والے پہلے شخص ہیں جن کا تعلق شعبہ سیاست سے تھا وہ 12 اپریل سنہ 1985ء کو امریکہ کے شٹل مشن SID کے ذریعے خلاء میں پہنچے۔

ٹر...ٹر...ٹرو میاں

علی جبران

آیئے آج آپ کی ملاقات مینڈک میاں سے کرائیں۔

برسات کے موسم میں آپ میں سے اکثر نے مینڈک کو اِدھر سے اُدھر پھدکتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ ویسے بھی یہ تالابوں اور نالوں میں پائے جاتے ہیں۔ جب کچھ مینڈک مل کر ٹرّاتے ہیں تو عجیب ساراگ پیدا ہوتا ہے۔

مینڈک کی گردن بالکل غائب ہے۔ اس کے مچھلیوں جیسے پر نہیں لیکن یہ اپنے پنجوں کی مدد سے اچھی طرح تیر سکتا ہے۔

مینڈک میاں کی شکل اگرچہ بہت مکروہ ہے لیکن یہ انسان کا بہت خیر خواہ ہے۔ یہ مچھروں اور ان کے انڈوں کو چٹ کر جاتا ہے۔ اس کا زیادہ تر ننھے کیڑوں پر گزارہ ہوتا ہے۔

اس کی زبان عجیب طرح کی ہوتی ہے اور جانوروں کے بالکل اُلٹ۔ آگے سے پیوست اور

پیچھے سے آزاد۔ یعنی اس کی زبان منہ سے گلے کی طرف جاتی ہے۔ یہ دانتوں سے خوراک چبانے کا کام نہیں لیتا بلکہ شکار کو پھنسانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ بہت ہی مکار شکاری ہے۔ جو بھی مکھی یا مچھر اس کے سامنے آتا ہے فوراً" شکار کرلیتا ہے۔ مگر بے چارہ خود بڑی مچھلیوں، مگر مچھوں اور سانپوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔

اس میں عجیب بات یہ ہے کہ یہ چھ مہینے کھائے پیئے اور سانس لئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ جب جوہڑوں سے پانی ختم ہوجاتا ہے تو یہ زمین میں سُوراخ کرکے بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ناک اور منہ بند کرلیتا ہے۔ اس دوران یہ بالکل حرکت نہیں کرتا اور ست پڑا رہتا ہے۔ اصل میں یہ سانس اپنی جلد کے ذریعے لیتا ہے اور جو چربی جلد میں جمع ہوتی ہے وہی اس کی خوراک بن جاتی ہے۔

"بی مینڈکی" انڈوں کا ذخیرہ اپنے پیٹ میں کئی دن رکھ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک مینڈکی مرجائے تو وہاں اگلے سال بارش ہونے پر یا ویسے ہی پانی چھڑکنے پر کئی مینڈک پیدا ہوجاتے ہیں۔ "بی مینڈکی" جب انڈوں کا ذخیرہ پیٹ سے باہر نکالتی ہے تو وہ لیس دار مادے میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اکھٹے ہی پانی کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں۔

گرمی کی وجہ سے جب انڈوں سے بچے باہر نکلتے ہیں تو پہلے لاروے کی شکل میں ہوتے ہیں۔ پھر مچھلی کی مانند شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد مینڈک زمین پر آجاتے ہیں۔

بجلی کی ایجاد میں مینڈک کا بہت حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سائنس دان نے ایک مینڈک کو چیر پھاڑ رکھا تھا۔ اس میں زندگی کے آثار بالکل ختم ہوگئے تھے۔ اتفاقاً" بجلی کا تار اس کے پنجے کو چھوا تو اس میں حرکت پیدا ہوگئی۔ اسی حرکت نے بجلی کے متعلق بڑی بڑی ایجادوں کو جنم دیا۔ جب مینڈک راگ الاپتے ہیں تو ان کے منہ سے رنگ دار "جھلیاں" نکلتی ہیں۔ جھلیوں کی رنگت سے مینڈک کی عمر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چھوٹی عمر کے مینڈکوں کی جھلیوں کا رنگ زرد ہوتا رہتا ہے۔ بوڑھے مینڈک کی کھوپڑی میں جو مٹی جمع ہوتی ہے وہ زہریلے سانپوں کے ڈنگ مارنے والی جگہ پر رکھیں تو وہ زہر چوس لیتی ہے۔ سپیرے اسے "سانپ کا منکا" کا نام دیتے ہیں۔ مینڈک کا بائیولوجیکل نام "راناٹگرینا" ہے۔

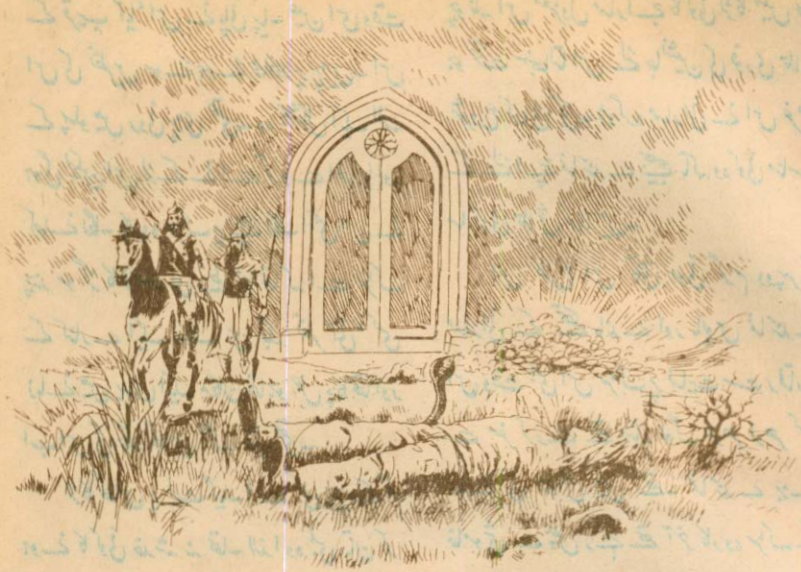

بھکاری راجہ

ترجمہ: صابر ناروی

پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے اس شریر لڑکے کو جو رات کسی نالے ہی میں پڑا رہتا تھا' دنیا کے امیر ترین آدمی کا اعزاز حاصل ہوا اور اس اعزاز کے لئے وہ ایک ناگ کا احسان مند ہے۔ ہندوستان کی اس گرد آلود سڑک پر چند مسافر ہی نظر آرہے تھے۔ گرمی شدت کی تھی اس راستہ پر ڈاکوؤں کی کثرت تھی۔ سلطنت کے حکمران کا نام ..... گائیکوار تھا۔ وہ جاگیرداری نظام کا پروردہ تھا۔ اس کے غلام اس سڑک پر چلنے والوں سے جبراً" خراج وصول کرتے تھے۔ اس سڑک کا سفر خطرناک بھی تھا اور مہنگا بھی' صرف غریب اور بہادر لوگ ہی بے پناہ گرمی میں اس سڑک پر سفر کرنے کی جرأت کرسکتے تھے۔ دوپہر کے قریب جب دیہاتیوں سے محصول وصول کرنے والا چنگی محرر اونگھ رہا تھا' گندے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک لڑکا کنویں

کے قریب آیا، اس نے پانی پیا۔ عین اسی وقت اس کی نظریں سوئے ہوئے محافظ پر پڑیں۔ اس کے پہلو میں روٹی پڑی تھی۔ وہ بمشکل ایک لقمہ ہوگی لیکن اس لڑکے نے اسے گرد سے اٹھالیا اور کھانے لگا۔ پھر وہ سڑک پر چلنے لگا۔ ابھی اس نے چند سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اسے سڑک کے کنارے ایک صاف سی جگہ نظر آئی، کسی زمانے میں یہاں ایک مکان تھا جو جل چکا تھا اور اب اس کی جگہ گھاس آگ آئی تھی۔

لڑکا گھاس پر لیٹ گیا۔ اسے کسی چیز کے گم ہونے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ لمبی تان کر سوگیا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے وہ جلد ہی گہری نیند سے ہمکنار ہوچکا تھا۔ لیکن اس کی قسمت کا ستارہ طلوع ہوچکا تھا یہ لڑکا سونے سے پہلے ایک بھکاری تھا لیکن جاگنے کے بعد وہ دنیا کا امیر ترین اور مشہور ترین شخص بن چکا تھا۔ یہ قصہ سنہ ۱۸۵۷ء کے وسط کا ہے۔ بڑودھا کے مہاراجہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک نمائندے کو زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ مہاراجہ اتنا طاقتور تھا کہ اسے سزا دینا سخت خطرناک تھا۔ لیکن یہ واقعہ کوئی معمولی نوعیت کا نہیں تھا اور اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے مہاراجہ کو اس جرم کی پاداش میں معزول کردیا۔

چونکہ اس معزول مہاراجے کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ جو تخت سنبھالتا اس لئے جانشین کی فوری تلاش شروع کردی گئی۔ ڈوگرہ مہارانی نے اس غرض کے لئے اپنے نمائندے بھیجے تاکہ وہ کوئی مناسب سا آدمی تلاش کرلائیں۔

اس طرح اس تپتی ہوئی گرم دوپہر کو مہارانی کے تھکے ماندے اور مایوس نمائندے اس وقت بھی اس سڑک پر نہایت ست رفتاری سے سفر کررہے تھے جبکہ لوگ ادھر ادھر کسی سائے کی تلاش میں تھے۔ نمائندے بڑے خاموشی سے چل رہے تھے آخر کار وہ سڑک کے اس موڑ پر پہنچے جہاں ایک مکان جلا ہوا تھا ان میں سے ایک نمائندہ سانس لینے کے لئے سڑک پر ایک ساتھی کی آستین پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ سڑک کے چند گز کے فاصلے پر ایک صاف جگہ پر میلے کچیلے کپڑوں والا ایک لڑکا گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک خوف ناک ناگ پھن پھیلائے اس طرح ایستادہ تھا کہ اس کا سایہ لڑکے کے چہرے پر پڑتا تھا۔ "کیا یہ شخص جس کے چہرے پر خوف ناک ناگ سایہ کئے ہوئے تھا تخت و تاج کا وارث نہیں بن سکتا؟" نمائندے خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے کیونکہ ان کی طویل تلاش ایک ڈرامائی انداز میں خاتمے پر پہنچ چکی

تھی۔

وہ قریبی درخت کے سائے میں بڑی بے صبری سے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے جتی کہ ناگ چلا گیا تب انہوں نے اس افسردہ لڑکے کو جگایا اور اسے اس کی خوبیٔ تقدیر سے مطلع کیا۔ درباریوں نے اپنے انتخاب کو درست ثابت کرنے کے لئے یہ مشہور کردیا کہ اس لڑکے کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں ایک جنگلی قبیلے کے سردار رہ چکے ہیں۔ چنانچہ کچھ اس مفروضہ "فیملی گراؤنڈ" کی وجہ سے اور کچھ ناگ کی مہربانیوں سے ایک لڑکے کو بڑودھا کا مہاراجہ بنادیا گیا۔ اس بھکاری کی نیک دلی سے لوگوں نے جلد ہی تعلیم حاصل کرلی۔ جب اس نے تخت و تاج سنبھالا تو یہی سلطنت اپنی جاہلیت کے حوالے سے بدنام تھی اور اس کے تین لاکھ باشندے غلاموں کی سی زندگی بسر کررہے تھے لیکن اس کے تخت و تاج سنبھالنے کے بعد یہی خطہ ترقی کی اعلیٰ منزل پر سرفراز ہوگیا' لوگ خوشحال تھے۔ اس نے رسوائے زمانہ ذات پات کی تمیز بھی ختم کردی۔ اس نے گاؤں میں صاف پانی بہم پہنچانے کا بندوبست بھی کیا اور ہر گاؤں میں کم ازکم ایک اسکول ماسٹر اور ایک ڈاکٹر بھی تعینات کیا۔

اس نے ریاست میں پارلیمانی نظام حکومت رائج کیا اور پارلیمنٹ سے ایک قانون بھی پاس کرایا جس کی رو سے زیادہ شادیاں کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ بچوں کی چھوٹی عمر میں شادی کرانے پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ بڑودھا کی سلطنت ہندوستان میں آزادی پر یقین رکھنے والوں کے لئے روشنی کا ایک مینار ثابت ہوئی۔

●●

تین چیزیں

- تین چیزوں کا احترام کرو۔
  والدین' استاد' قانون
- تین چیزوں پر قابو رکھیں۔
  دل' زبان' غصہ
- تین چیزوں سے کام لو۔
  ہمت' عقل' نرمی
- تین چیزیں سوچ کر اٹھاؤ۔
  قلم' قدم' قسم
- تین چیزوں کو یاد رکھو۔
  موت' احسان' نصیحت
- تین چیزوں کو پاک رکھو۔
  خیالات' جسم' لباس
- تین چیزوں پر ایمان رکھو۔
  آخرت' توحید' رسالت

وطن تمہارا وطن ہمارا

خوش بخت وحید رضوی

وطن ہے تمہارا، وطن ہے ہمارا
مگر اس وطن کو ہمیں نے بگاڑا

وہ پیار و محبت، وہ ایثار و قربت
نہ جانے کہاں ہے وہ امن و سکوں اب

جدھر دیکھو دہشت، جدھر دیکھو وحشت
نہیں ہے کہیں بھی، وہ پیار و محبت

بھلا کیوں وطن میں سبھی ہیں پریشاں
جو شعلوں کا گھر ہے، وہ تھا اک گلستاں

میرے اس چمن میں سبھی گل نئے تھے
جو کملا گئے ہیں، وہی کل ہرے تھے

اگر آج ہم تم بھی ہوجائیں یکجا
تو میرا وطن ہو ارم کا نظارا

بدقسمت ریاست

امجد فرید

آج جس بدقسمت ریاست کا حال قلم بند کیا جارہا ہے اس کا نام جوناگڑھ ہے جو کہ پچھلے 49 برس سے ہمارے پڑوسی دشمن ملک بھارت کے قبضے میں ہے۔ آج ہمارے ملک کی اکثریت اس ریاست کے نام تک سے ناواقف ہے۔

اس ریاست کا کل رقبہ 3 ہزار 6 سو مربع میل تھا جبکہ 568 مربع میل رقبے پر جنگل کے وسیع و عریض سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آبادی 7 لاکھ 36 ہزار کے لگ بھگ تھی اور یہ ریاست کاٹھیاواڑ کے جنوب مغرب میں واقع تھی۔ پورے برصغیر میں صرف اسی ریاست میں ببر شیر کی نسل پائی جاتی تھی۔ اس ریاست کی دو بندرگاہیں نوا بندر اور ویراول تھیں۔ یہاں کی اکثریت تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھی۔ یہاں کی آبادی میں ہندو اکثریت میں تھے مگر حکومت جو کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اس کے بلاامتیاز

روپے سے وہ بہت مطمئن تھے۔ غازی سلطان محمود غزنوی کا فتح کردہ ہندوؤں کا مقدس ترین مندر "سومنات" اسی ریاست میں واقع تھا اسی وجہ سے ہندو اس ریاست کو بہت متبرک گردانتے تھے۔

جب 3 جون سنہ 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کا اعلان کیا گیا تو ہر خودمختار ریاست کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کر سکتی ہے۔ جس کی بناء پر جوناگڑھ کی ریاست کے نواب نے بڑی سوچ بچار اور لوگوں کے صلاح و مشورے کی روشنی میں پاکستان کے ساتھ 14 اگست سنہ 1947ء کو الحاق کا اعلان کردیا مگر ہندوستان نے جوناگڑھ کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے روکنے کے لئے کئی اقدامات کئے۔

ہندوستانی حکومت اور اردگرد کی ریاستوں نے بھی حکومت اور نواب پر الحاق کے فیصلہ پر نظرثانی کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔ ساتھ ہی بھارت نے جوناگڑھ کی سرحدوں پر اپنی فوج کی بھاری نقل و حرکت بھی شروع کردی تاکہ وہاں کے عوام کو خوف و ہراس میں مبتلا کیا جاسکے۔ جونا گڑھ کی حکومت میں کچھ کالی بھیڑیں بھی پیدا ہوگئی تھیں، گویا کہ اب وہی صورت حال پیدا ہورہی تھی کہ

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ان کالی بھیڑوں کا سرغنہ جوناگڑھ کی حکومت کا ایک انگریز وزیر کیپٹن ہاروے جونز تھا۔ اس نے بھارتی حکومت کو جوناگڑھ کے اندرونی حالات سے باخبر رکھنا شروع کردیا اور اندر ہی اندر بھارتی حکومت سے ساز باز شروع کردی۔

ایک روز یہ غدار انگریز وزیر جوناگڑھ سے فرار ہوکر بھارت جاپہنچا اور جوناگڑھ کی تمام اندرونی کمزوریاں اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس کی غداری نے اس ریاست کو بہت نقصان پہنچایا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے فی الفور جوناگڑھ پر حملہ کردیا اور آخر کار وہ منحوس گھڑی آپہنچی جب اس پاکستانی ریاست کی قسمت پر بھارتی غلامی کی مہر ثبت ہونے والی تھی۔ 9 نومبر سنہ 1947ء کے سورج نے آخری بار اس ریاست کو پاکستانی ریاست کی حیثیت سے دیکھا اور شام تک بھارتی فوج ریاست میں داخل ہوچکی تھی۔ ریاستی فوج نے مزاحمت کی کوشش کی مگر وہ زیادہ تعداد میں تھے اور یہ اس بڑی فوج کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اور

اس طرح یہ بدقسمت ریاست قیام پاکستان کے صرف 2 ماہ اور 26 دن بعد غلامی کی زنجیروں میں جکڑلی گئی۔

جب بھارت نے جونا گڑھ پر قبضہ کیا تو وہ یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ وہاں پر ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی مگر اس سلسلے میں وہ کشمیر کو بھول جاتا ہے کہ جہاں 88 فیصد مسلمان آبادی تھی اور وہاں کے راجہ نے مسلمان آبادی کی خواہش کے خلاف کشمیر کا الحاق بھارت سے کردیا اور بھارت نے اسے قبول کرلیا۔ کیا یہ دوغلی پالیسی نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ ہمیں خواب غفلت سے بیدار اور متحد ہونا چاہئے۔ تاکہ اپنی اس ریاست کو بھارت کے خونیں پنجے سے نجات دلواسکیں۔

"اپنے آپ کو"

○ ..... دنیا میں چار قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔

○ ..... پہلے وہ جو کچھ نہیں جانتے اور نہیں جانتے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

○ ..... دوسرے وہ جو کچھ نہیں جانتے اور جانتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

○ ..... تیسرے وہ جو سب کچھ جانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔

○ ..... چوتھے وہ جو سب کچھ جانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔

○ ..... پہلے قسم کے لوگ بے وقوف ہیں، ان سے گریز کیجئے۔

○ ..... دوسری قسم کے لوگ سادہ لوح ہیں، انہیں تعلیم دیجئے۔

○ ..... تیسری قسم کے لوگ خواب غفلت میں محو ہیں، انہیں بیدار کیجئے۔

○ ..... چوتھی قسم کے لوگ عقلمند ہیں، ان کی پیروی کیجئے۔

ذرا سوچئے کہ آپ کا شمار کس قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے؟

پیامِ اخوت

محمد ارشد بلال، گوجرانوالہ

مدین میں ایک قلعہ تھا جہاں صحابی رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت سلمان فارسیؓ رہتے تھے۔ حضرت اشیعت ابن قیسؓ اور حضرت جریر بن عبداللہؓ وہاں آئے تو انہیں حضرت سلمان فارسیؓ سے ملنے کا شوق ہوا۔حضرت سلمان فارسیؓ سے ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگے "کیا آپ ہی سلمان فارسیؓ ہیں؟" شاید اس وجہ سے کہ ان حضرات نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا ہو دوسرے حضرت سلمان فارسیؓ کی سادگی ضرب المثل تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو پہچاننے میں دقت ہوتی۔ان حضرات نے پوچھا "آپ رسولؐ اللہ کے ساتھی ہیں؟" آپ نے فرمایا "یہ تو میں نہیں جانتا البتہ میں نے حضور نبی کریمؐ کی زیارت ضرور کی ہے اور آپؐ کی صحبت سے فیض یاب بھی ہوا ہوں۔لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آپؐ کا ساتھی ہوں کیوں کہ حضورؐ کا ساتھی تو وہ ہے جو آپؐ کے ساتھ جنت میں داخل ہوا اور میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟"

حضرت اشیعت ابن قیسؓ اور حضرت جریر بن عبداللہؓ نے کہا کہ "ہم دونوں آپؓ کی خدمت میں آپ کے اس بھائی کے پاس سے آئے ہیں جو ملک شام میں ہیں اور ان کا نام حضرت ابوالدرداءؓ ہے۔" یہ سنتے ہی حضرت سلمان فارسیؓ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔انہوں نے فرمایا "میرے دوست کا وہ ہدیہ کہاں ہے جو تمہارے ہاتھ انہوں نے میرے لئے بھیجا ہے۔" تو ان دونوں نے کہا کہ "حضرت ابوالدرداءؓ نے تو آپ کے لئے کوئی تحفہ نہیں بھیجا۔" حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا "ایسا تو نہ کہو بارہا لوگ حضرت ابوالدرداءؓ سے مل کر آتے رہے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے تحفہ نہ بھیجا ہو۔" دونوں نے کہا "حضور ہم سچ کہہ رہے ہیں انہوں نے تو کوئی تحفہ نہیں بھیجا۔ اگر آپ کوئی مال اسباب چاہتے ہیں تو ہمارا مال حاضر ہے۔" حضرت سلمانؓ نے کہا "نہیں مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف وہ ہدیہ چاہئے جو حضرت ابوالدرداءؓ نے میرے لئے بھیجا ہے۔"

دونوں حضرات نے کہا "تحفہ تو انہوں نے کوئی نہیں بھیجا البتہ چلتے وقت اتنا ضرور کہا تھا مدین جانا تو سلمان فارسیؓ سے ضرور ملنا اور ان سے میرا سلام کہنا۔" حضرت سلمانؓ نے کہا "میں اتنی دیر سے تم سے صرف اس ہدیے کا مطالبہ تو کر رہا تھا سلام سے بڑھ کر بہتر ہدیہ اور تحفہ کیا ہوگا۔" لیکن بچو! آج ہمارا حال یہ ہے کہ کسی سے مطلب ہو تو سلام کرتے ہیں اور مطلب ہو تو سلام کا جواب دیتے ہیں۔مگر یہ کوئی بھی نہیں سوچتا کہ یہ سلامتی کی دعا ہے اور سلامتی کا محتاج کون نہیں؟ لیکن ہم ساتھی اس میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔ جو کہ اچھی بات نہیں۔

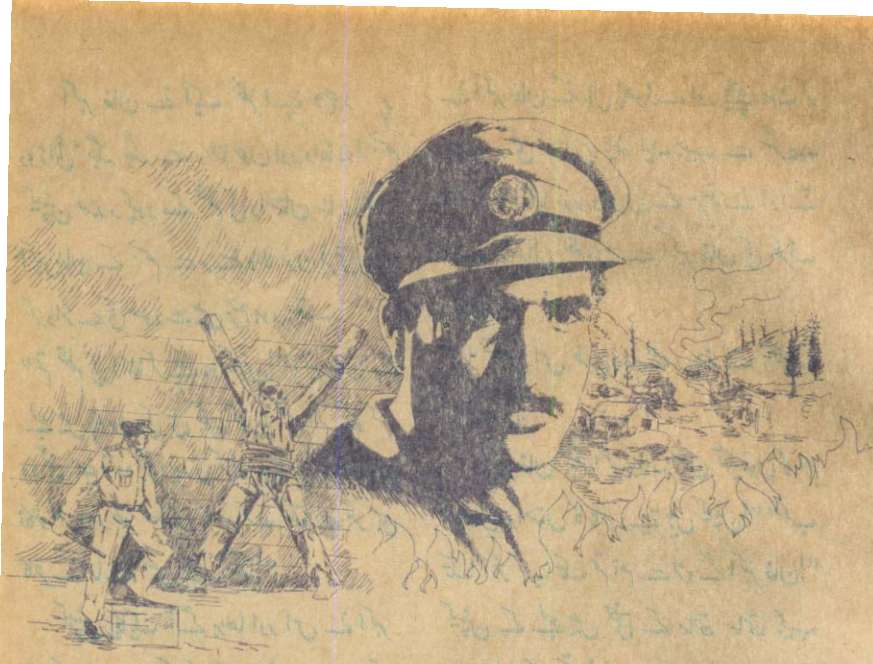

چھٹتے بادل

جدون ادیب

کیپٹن مہندر کپور بڑی شان سے چلتا ہوا ٹارچر سیل میں داخل ہوا، قدموں کی آہٹ سن کر پاکستانی نژاد مجاہد اکبر خان نے سر اٹھایا، کیپٹن کو دیکھ کر اس لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

کیپٹن نے ستون سے بندھے اکبر خان کو طنزیہ انداز میں مسکراتا دیکھ کر غصے کی ایک لہر اپنے بدن میں دوڑتی محسوس کی اور اس کا منہ ایک عجیب سے انداز میں بن گیا!

"اکبر خان! کیا حال ہیں!" کیپٹن نے لب کشائی کی!

"مسلمان جس حال میں بھی ہو اپنے اللہ کا شکر ادا کرتا ہے!" اکبر خان نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں اکبر خان نہیں! تم تکلیف میں ہو اپنا جھوٹا بھرم رکھنے کے لئے تم جھوٹ بول رہے ہو دیکھو ضد مت کرو اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتادو اور....."

اکبر خان نے ایک نظر اپنے وجود پر دوڑائی، جگہ جگہ سے رستا خون اور داغا ہوا جسم کیپٹن مہندر کپور کے ظلم کی داستان سنا رہا تھا۔ اکبر خان کے جسم سے رسنے والا خون فرش پر گر کر دائرے کی صورت میں جمع ہو رہا تھا۔

"تم ظلم کی انتہا کر چکے ہو کیپٹن!" اکبر خان کے لہجے میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی اگر کچھ کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر لو اپنے دل کے ارمان نکالو مگر یاد رکھو مسلمان کا سر کٹ سکتا ہے مگر کسی کافر کے سامنے نہیں جھک سکتا!"

کیپٹن یکایک آگے بڑھا اور اس نے اکبر خان کو بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور چلا کر بولا "تم موت کے بہت قریب ہو اکبر خان، میں تمہارا علاج کرواؤں گا اور پھر....." اس کا لہجہ بہت زہریلا تھا۔ "اور پھر میں ایک دفعہ پھر تم سے سب کچھ اگلوانے کی کوشش کروں گا اور بھگوان کی کرپا (مہربانی) سے تم سے سب کچھ اگلوالوں گا!"

"آزادی کا سورج طلوع ہونے تک مجھ جیسے ہزاروں اکبر خان آتے رہیں گے اور تمہیں خود اپنے بال نوچنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔" اکبر خان نے کیپٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا! کیپٹن چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اکبر خان کے بال چھوڑے اور پیچھے ہٹ کر وہیں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھویں کے مرغولے اڑاتے ہوئے پرخیال نظروں سے اکبر خان کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا تمہیں اس طرح بندھے رہنے سے تکلیف نہیں ہوتی!"

اکبر خان مسکرا کر بولا۔ "ان تکلیفوں کو ہم مسلمان راحتوں کا نام دیتے ہیں کیپٹن!" "کب تک، آخر کب تک تم ہم سے لڑو گے اکبر خان!" کیپٹن کے لہجے میں سختی کے ساتھ ساتھ عجیب سی بے بسی بھی تھی!

"جب تک آزادی کا سورج طلوع نہیں ہو جاتا!"

"تمہاری آزادی کے سورج کے آگے ہم نے امریکہ، اسرائیل، روس، برطانیہ اور مصلحتوں اور غداروں اور سازشیوں کے بادل کھڑے کر رکھے ہیں!"

اکبر خان نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو بے اختیار جھٹکا دیا اور کرخت لہجے میں بولا "بادلوں کی طرف مت دیکھو کیپٹن! بادلوں کو چیرتی کرنیں چیخ چیخ کر عقب میں موجود آزادی کے سورج کا پتہ دے رہی ہیں کہ آزادی کا سورج طلوع ہوا چاہتا ہے! اور تمہارے بادل تو

اپنے سفر کے لئے ہواؤں کے محتاج ہیں.....!"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو!" کیپٹن الجھ کر رہ گیا۔

"سیدھی سی بات ہے کیپٹن!" اکبر خان بولا "تم نے کشمیر کی آزادی کے سورج کے آگے جو بادل کھڑے کیے ہیں وہ فقط ریت کی ایک دیوار ہیں ایسی دیوار جس کو زمین بوس ہونے کے لئے ایک نعرہ ہی کافی ہے!"

"کون سا نعرہ!" کیپٹن بے اختیار بولا۔

اکبر خان نے اپنی گرتی ہمت کو مجتمع کر کے حلق پھاڑ کر کہا "نعرۂ تکبیر!"

کیپٹن نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر بوکھلاہٹ میں وہ کرسی سمیت الٹ کر رہ گیا عین اسی لمحہ ..... کیپٹن کے کانوں میں "اللہ اکبر" کا جواب آیا اور دوسرے ہی لمحے ایک فائر گونجا اور پھر فضا فائرنگ اور انسانی چیخوں کی آوازوں سے گونجنے لگی.....

کیپٹن تیزی سے اٹھا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا او اس نے کانپتے ہاتھوں سے پستول نکالا اور ٹریگر پر انگلی رکھ کر اکبر خان کی طرف دیکھنے لگا جو باہر ہونے والی فائرنگ اور انسانی چیخوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "میرے بھائی آ گئے!"

کیپٹن تیزی سے مڑا مگر اچانک ٹارچر سیل کا دروازہ کھلا اور کیپٹن کے ہاتھوں سے پستول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

دروازے پر ایک مجاہد کھڑا تھا چہرے پر نقاب بندھا ہوا تھا اس کی چمکتی آنکھیں اور ہاتھوں میں پکڑی اسٹین گن اور ٹریگر پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتا دباؤ ..... کیپٹن کو موت دکھا گیا ..... "اکبر بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں نا!" مجاہد نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا!

"ہاں ....." اکبر خان کی ہمت جواب دے گئی' اپنوں کو دیکھ کر اس کا دل اپنوں کی بانہوں میں سمانے کو چاہنے لگا اور اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں!

مجاہد کے اشارے پر کیپٹن نے اکبر خان کو کھولا۔ اکبر خان لڑکھڑاتے قدموں سے مجاہد کے بازوؤں میں جھول گیا!

"یہ لو اکبر بھائی! مارو اس کتے کو!"

اکبر خان نے اسٹین گن پکڑ کر کیپٹن کی طرف سیدھی کی کیپٹن تھر تھر کانپنے لگا۔

"بھگوان کے لئے ..... نہیں نہیں خدا کے لئے مجھے شما کردو نہیں نہیں مجھے معاف کر دو....."

"کیپٹن! تم نے بہت ظلم کرلیا اب اختتام آپکا

ارشاداتِ پیغمبر

○ ...... اخلاق کا اچھا ہونا محبتِ الٰہی کی دلیل ہے۔
○ ...... دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔
○ ...... جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کرو۔
○ ...... آپس میں سلام کا رواج عام کرو، محبت بڑھے گی۔
○ ...... جو شخص اپنے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔
○ ...... کسی انسان کے دل میں ایمان اور حسد اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

مرسلہ ...... منزوہ شیر جنگ۔ گجرات

ہے کیونکہ ہر ظلم کا خاتمہ ضرور ہوتا ہے۔" اکبر خان کے لہجے میں نفرت تھی!

کیپٹن کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے "مم ..... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں نے تم پر ...... بہت ظلم کیا ہے مگر ..... مجھے شما کردو ......"

اکبر خان ٹریگر سے انگلی ہٹاتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ میرے اندر نفرت کا جذبہ شدت سے عود کر آتا ہے لیکن میں تمہیں حضرت علیؓ کی تقلید میں نہیں مار سکتا.....

"اکبر بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" مجاہد تیز لہجے میں بولا۔

"اس وقت کا تصور کرو منیر!" اکبر خان نے مجاہد سے مخاطب ہو کر کہا "جب دوران جنگ ایک کافر نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر اسے معاف کر دیا تھا کہ اب تم میرے ذاتی دشمن ہو گئے ہو اس سے قبل میں تمہیں اسلام کا دشمن سمجھ کر لڑ رہا تھا!"

کیپٹن کی آنکھوں میں امید و بیم کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔

اکبر کہہ رہا تھا "میں علیؓ کی تقلید میں کیپٹن کو معاف کرتا ہوں۔"

اکبر خان کے اشارے پر مجاہد منیر نے کیپٹن کو ٹارچر سیل میں بند کر دیا۔

چند روز بعد اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کیپٹن مہندر کپور کا کورٹ مارشل ہو گیا ہے! کیونکہ اس نے کشمیر کے محاذ پر لڑنے سے انکار کر دیا تھا ..... اکبر خان کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ البتہ اسے حیرت بالکل بھی نہیں ہوئی تھی۔

روشنی

عظمت والا مہینہ

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ شعبان کی آخری رات کو نبی اکرم صلی علیہ وسلم نے خطبہ دیا "اے لوگو! ایک بڑی عظمت اور برکت والا مہینہ قریب آگیا ہے۔ وہ ایسا مہینہ ہے جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے اور اس کی راتوں میں تراویح پڑھنا نفل قرار دیا ہے۔ جو شخص اس مہینہ میں کوئی نیک کام خوشی سے کرے گا تو وہ ایسا ہو گا جیسے کسی دوسرے مہینہ میں فرض ادا کیا ہو اور جو اس مہینہ میں فرض ادا کرے گا تو وہ ایسے ہو گا جیسے کسی دوسرے مہینے میں کسی نے ستر فرض ادا کئے اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنّت ہے اور یہ مہینہ معاشرے کے غریب اور حاجت مند افراد سے مالی ہمدردی کا مہینہ ہے۔

کا سورج چمکانا ہے

آصف وقار آصف

ہر مشکل سے لڑنا ہوگا
خود کو ثابت کرنا ہوگا

وقت کی دوڑ میں آگے بڑھ کر
سخت مقابلہ کرنا ہوگا

کل کا جو بھی قرض ہے باقی
آج ادا سب کرنا ہوگا

ہر رنجش، نفرت کو بھلا کے
مل کر آگے بڑھنا ہوگا

حق ہے وطن کا ہم پر بے حد
وطن کی خاطر مرنا ہوگا

سچ کا سورج چمکانا ہے
جھوٹ کی شب کو بدلنا ہوگا

جس سے ہو سب کی عزت
آصف ایسا کرنا ہوگا

طارق اسماعیل صابر، ہری پور

پولیس مقابلہ

ہمارے ایک کزن ہیں طاہر۔ شرارت تو گویا ان کی نس نس میں بھری ہوئی ہے۔ وہ طاہر کے نام سے کم اور "شیطان" کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ہماری ایک آنٹی ہیں جو کہ اکیلے میں بہت ڈرتی ہیں۔ انکل جب بھی پنجاب جاتے ہیں میں ان کے ہاں سوتا ہوں ایک دفعہ ہوا یوں کہ ماموں کام کے سلسلے میں پنجاب گئے ہوئے تھے۔ طاہر نے ہمیں ڈرانے کا منصوبہ بنایا۔

رات کے تقریباً ۱۲ بجے تھے۔ طاہر انکل کی کوٹھی کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نقاب چڑھا ہوا تھا۔ وہ کوٹھی کے قریب آیا اور گیٹ پر چڑھنے لگا۔ دل ہی دل میں وہ ہمیں کانپتا دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ لیکن اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ اس دفعہ اُلٹا آنتیں اس کے گلے پڑنے والی ہیں۔ ابھی اس نے گیٹ پھاندا نہیں تھا کہ پولیس کی گشتی گاڑی وہاں آگئی۔

انہوں نے فوراً" طاہر کو قابو کرلیا۔ طاہر نے انہیں لاکھ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ چور نہیں بلکہ صرف شرارت کررہا تھا۔ لیکن پولیس والوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی ۔ گھر والوں سے تصدیق کی زحمت بھی نہ کی اور طاہر کو گاڑی میں ڈال کر سیدھا تھانے لے گئے' وہاں اس کا وہ حشر نشر ہوا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ پولیس والے بار بار طاہر سے پوچھتے کہ اس نے اس سے پہلے کتنی وارداتیں کی ہیں؟ جونہی طاہر "شرارت" کا نام لیتا۔ مولا بخش اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے سے علیک سلیک کرجاتا۔ طاہر کو اتنی مار پڑی کہ اس کے حواس اس کے قابو میں نہ رہے۔ یہاں تک کہ اس نے پولیس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور جو کچھ پولیس والے اس سے کہتے بلاچوں چراں کئے ان کی بات مان جاتا۔ صبح ہوئی تو پولیس والے ان کے گھر کی تلاشی کے لئے آگئے۔ ماموں بھاگ کر تھانے گئے۔ وہاں طاہر نے رو رو کر اپنی داستان انہیں سنائی۔ ماموں کا چونکہ اس علاقے میں سیاسی ہولڈ کافی اچھا تھا۔ اس لئے پولیس والوں نے ان کی بات کا یقین کرلیا پر مزید یقین کے لئے آنٹی کے پاس لے گئے۔ آنٹی کی یقین دہانی پر پولیس سے طاہر کی جان تو چھوٹ گئی مگر طاہر کو چھوڑتے ہوئے پولیس والے اپنی محنت کی قیمت وصول کرنا نہیں بھولے تھے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن ہے طاہر شرارتوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ جب کبھی اسے تھانے چلنے کا کہو تو کانوں کو ہاتھ لگالیتا ہے۔ اس دن کے بعد وہ کبھی بھی عشا کی نماز کے بعد گھر سے نہیں نکلا۔ ویسے نمازیں بھی تھانے سے واپسی پر اس نے شروع کی ہیں۔

●●

پشتو ادب سے

جب دل ہار جائے

ایک دن لیک ہرن کے بچے نے اپنی ماں سے پوچھا "ماں! آپ کتے سے بڑی ہیں اور اس سے تیز دوڑ سکتی ہیں، آپ کے سینگ بھی ہیں جن سے اپنا بچاؤ کر سکتی ہیں، پھر کیا بات ہے کہ آپ کتے سے اتنا ڈرتی ہیں؟" ہرنی نے اپنی بچے سے کہا۔ "بیٹا! تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کروں جب کتے کی آواز سنتی ہو تو ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں، دل کہتا ہے کہ بھاگ جاؤں اور بیٹا..... جب دل ہار جائے تو پھر بہادری باقی نہیں رہتی۔"

مرسلہ قلندر مومند، پشاور

مکڑی

مرسلہ: گلشن کمار پروانہ، بلوچستان

مکڑی کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑتی۔ وہ ایک جالا تن کر چپکے سے بیٹھ جاتی ہے اور اپنے شکار کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ مکڑی بے چاری کی حیثیت ہی کیا ہے۔ لیکن اس کے جالے کو دیکھ کر اس کی ذہانت کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اسے جیومیٹری، یا ریاضی کے اصولوں کا کیا پتا۔ لیکن وہ جس انداز سے اپنا جالا بناتی ہے۔ وہ ہم سب کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس کا جالا ہماری نظر میں بہت کمزور ہوتا ہے۔ اور ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن مکڑی کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ جب اس کا شکار اس میں پھنس جائے گا تو کبھی باہر نہیں نکل سکے گا۔

مکڑی جو جالا بنتی ہے اس کے تار لیس دار ہوتے ہیں۔ اس کے بیچ میں ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے۔ جو لیس دار نہیں ہوتا۔ یہیں پر بیٹھ کر مکڑی اپنے شکار کا انتظار کرتی ہے۔ جب کوئی مکھی یا کوئی چھوٹا کیڑا اس جالے میں آکر پھنس جاتا ہے تو مکڑی اپنے پلیٹ فارم سے اس پر جھپٹتی ہے۔ مکڑی کے پاؤں میں ایک خاص قسم کا تیل ہوتا ہے۔ وہ جوں ہی اپنے شکار کو پکڑنے کے لئے دوڑتی ہے۔ اس کے پاؤں سے یہ تیل نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس تیل کی وجہ سے اس کا پاؤں لیس دار جالے میں نہیں پھنستا۔ مکڑی اپنے شکار کو پھانس کر اس کے ارد گرد لیس دار تار بناتی جاتی ہے۔ اور ان تاروں سے اس کو ایسا باندھ دیتی ہے کہ وہ رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد مکڑی اپنے شکار کو پوری طرح مزے سے ہضم کر لیتی ہے۔

●●

جگنو

محمد عمر قریشی، اسلام آباد

رات کو چمکے اک ستارہ
جگمگ جگمگ پیارا پیارا

جھیل کنارے جب بھی جاؤ
چم چم چم چم کرتا پاؤ

ہولے ہولے اُڑتا ہے
جلتا ہے پھر بجھتا ہے

کیسا پیارا نور ملا ہے
لیکن ہم سے دور ملا ہے

"جگنو" اس کا نام ہے بچو
روشن ہونا کام ہے بچو

سفید دائرے

یہ واقعہ میری پھوپھی جان کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ ان کا بیٹا اپنے دوست کے گھر سے واپس آیا۔ وہ لوگ ایک عمارت کی چوتھی منزل میں رہتے تھے۔ سردیوں کے دن تھے اور شام چھ بجے کا وقت۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا آرہا تھا کہ اس کی نظر دو زینوں کے درمیان واقع خالی جگہ پر پڑی۔ وہاں سفید رنگ کے دو دائرے بنے ہوئے تھے۔ اندھیرا بہت تھا۔ اس کو یوں لگا جیسے دائرے حرکت کررہے ہوں۔ اس نے چیخ ماری اور گرتا پڑتا اوپر پہنچا اوپر پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔ اتفاقاً" اس واقعہ کے کچھ دیر بعد ہم لوگ ان کے گھر گئے۔ ہمیں ابھی تک اصل واقعہ کا پتہ نہ تھا۔ جونہی ہم لوگ اس جگہ پہنچے، ہمیں بھی دائرے نظر آئے۔ ہم بھی ڈر گئے اور ڈرتے ڈرتے چیخیں مارتے ایک دوسرے سے لپٹتے ہوئے اوپر پہنچے۔ پھوپھی پریشان تھیں، ہمارا حال سن کر اور بھی پریشان ہوگئیں۔ وہ نیچے آئیں۔ انہوں نے اس جگہ کو دیکھا۔ اب تو مارے خوف کے ان کی بھی گھگی بندھ گئی۔ ہم لوگ پریشان اوپر بیٹھے رہے۔ اتنی دیر میں پھوپھی جان کا بڑا بیٹا بھی آگیا اس نے ہمارا حال سنا تو پریشان ہوگیا۔ اس نے نیچے جاکر دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے قریب جاکر دیکھا تو ہنس پڑا۔ اور اوپر آکر ہمیں بتایا کہ صبح کو وہ آٹا لایا تھا۔ آٹے کی بوری میں سوراخ تھا اور آٹا نکل رہا تھا تب اس نے شرارت سے آٹے کی مدد سے دو دائرے بنادیئے۔ یہ سن کر ہنسی کے فوارے چھوٹ پڑے۔ وہی گھر جہاں کچھ دیر قبل ڈر اور خوف کا سایہ چھایا ہوا تھا، وہیں اب ہنسی کے مقابلے ہورہے تھے۔ آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ہم ہنس پڑتے ہیں۔

●●

نوٹافلی

محمد حسن سروش، نوابشاہ

اس نام کو سن کر آپ یقیناً چونک گئے ہوں گے، اصل میں یہ ایک اصطلاح ہے..... نوٹوں سے متعلق۔ دنیا کے بہت کم افراد اس میں دلچسپی رکھتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک خاصا مہنگا مشغلہ ہے۔ اس کے باوجود عوام الناس کی ایک کثیر تعداد اس مشغلے سے وابستہ ہے۔ وہ یقیناً "شوق کا کوئی مول نہیں" کے مصداق پر عمل کرتے ہوں گے۔ اس مشغلے کے ذریعے نہ صرف گھر بیٹھے نوٹوں کی سیر کی جا سکتی ہے بلکہ ان کے بارے میں مفید اور کار آمد معلومات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔

کرنسی نوٹ جمع کرنے کے مشغلے کو اصطلاحاً "نوٹافلی" (Notaphily) کہا جاتا ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں "نوٹوں سے محبت" نوٹوں کا حصول بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ یہ نوٹ بڑی محنت سے اور بعض اوقات بڑے مہنگے داموں دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی دستیابی کا سب سے مقبول ذریعہ کرنسی نوٹ ڈیلر ہیں۔ جو کہ دنیا کے تقریباً ہر ملک اور شہروں میں ہوتے ہیں۔ ڈیلر حضرات خود بھی نوٹوں کے بارے میں بڑی اچھی معلومات رکھتے ہیں اور اس مشغلے کے شائقین کے بڑے اچھے رہنما ثابت ہوتے ہیں۔

کرنسی نوٹوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ کاغذ کی طرح کرنسی نوٹ بھی اہل چین کی ایجاد ہیں۔ چین میں کرنسی نوٹوں کی اشاعت کا آغاز مانگ خاندان کے عہد میں ہوا۔ اس سے قبل چین میں کانسی کے سکے رائج تھے۔ چھوٹی موٹی خریداری کے لئے سکوں کی ایک بڑی تعداد استعمال ہوتی تھی۔ سکوں کا اس بڑی تعداد میں استعمال کرنا نہ صرف دشوار تھا بلکہ غیر محفوظ بھی تھا کیونکہ اکثر یہ سکے دوران سفر لوٹ لئے جاتے تھے۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے چینی تاجروں نے کاغذ کے ڈرافٹ استعمال کرنا شروع کئے۔ انہی ڈرافٹوں نے آگے چل کر کرنسی نوٹوں کی اشاعت کا تصور دیا اور یوں نوٹوں کا رواج عام ہوتا گیا۔ کرنسی نوٹوں کے حوالے سے ہمارا ملک دنیا کا واحد ملک ہے جہاں سب سے زیادہ گندے، بوسیدہ اور

جگہ جگہ مختلف سلوشنز اور رنگ برنگی ٹیپوں سے جڑے ہوئے نوٹ پاتے جاتے ہیں جب کہ نئے نوٹوں کا دیدار عید کے روز ہی ہوتا ہے۔ کرنسی نوٹوں کا گندا پن دور کرنے کے کئی طریقے ہیں مثلاً انہیں پانی سے دھو کر بلاٹنگ پیپر کی دو شیٹوں کے درمیان رکھ کر خشک کر لیا جائے۔ اور پھر ان کی شکنیں دور کرنے کے لئے انہیں استری کر لیا جائے آج کل ڈاک ٹکٹوں کی البموں کی طرح سے کرنسی نوٹ جمع کرنے والی ایلبمیں بھی بازار میں باسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ جس طرح ڈاکٹ ٹکٹ جمع کرنے والا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس دنیا کے عام ممالک کے تمام ڈاک ٹکٹ موجود ہیں۔ اسی طرح سے "نوٹافلی" سے وابستہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس دنیا کے ہر ملک کے تمام کرنسی نوٹ موجود ہیں۔ کرنسی نوٹ جمع کرنا دنیا کے دوسرے مشاغل کی بہ نسبت ایک مشکل اور مہنگا ترین مشغلہ ہے لیکن ہمت کے آگے دنیا کا کوئی بھی کام مشکل نہیں

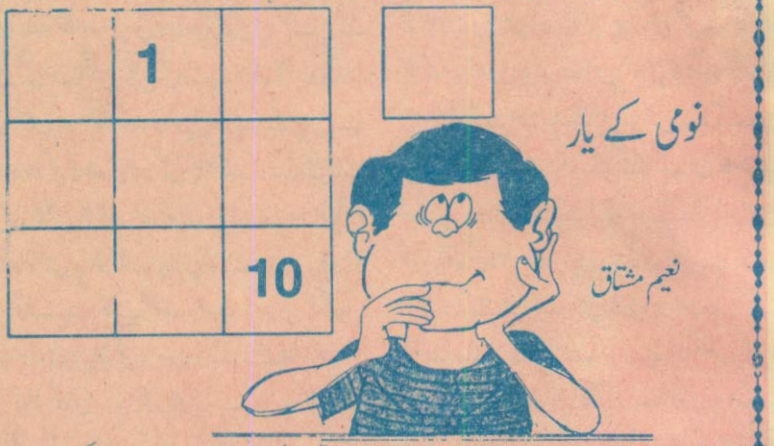

نومی کے یار

نعیم مشتاق

ایک کے بعد ہے آتا دو — تم بھی جلدی سے کہہ دو
تین آئے، پھر آئے چار — بن جاؤ گے تم ہوشیار
پانچ آتا ہے اور پھر چھ — سیکھ لو اس کو جلدی سے
سات آئے پھر آئے آٹھ — پوچھ لو امّی سے یہ بات
نو کے بعد نمبر دس — یاد یہی کرنا تھا بس
تم سب ہو نومی کے یار — بھول نہ جانا گنتی یار

بہادر کتا

مرسلہ: طارق محمود، کراچی

یہ واقعہ آسٹریلیا کے ایک سنسان اور ویران علاقے میں پیش آیا۔ "سینڈز" اس علاقے سے اپنے ٹرک پر گزر رہا تھا کہ اچانک ایک خطرناک موڑ پر اس کا ٹرک اُلٹ گیا اور وہ اس کے نیچے دب گیا۔ سینڈز بڑی مشکل سے گھسیٹ گھسیٹ کر ٹرک کے نیچے سے نکلا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر سخت چوٹ آئی تھی اور ٹانگیں کچل گئی تھیں۔ چلنا تو کیا وہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ وہیں ٹرک کے پاس بے سدھ ہو کر لیٹ گیا اور کسی کا انتظار کرنے لگا یکایک کائیں کائیں کا شور بلند ہوا۔ سینڈز نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس پر خوفناک پہاڑی کوے منڈلا رہے تھے وہ خوف سے کانپ اُٹھا۔ موت اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ وہ مدد کے لئے چلایا مگر اس کی آواز کوؤں کے شور میں دب کر رہ گئی۔ یہ خوفناک کوے اس کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس کا گوشت نوچ کر کھائیں۔ سینڈز نے آنکھیں بند کر لیں اب معجزہ ہی ان خونی کوؤں سے اسے بچا سکتا تھا۔ اس میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی پھر اچانک ایک معجزہ سا ہو گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ سینڈز نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک کتا بھونکتا ہوا اس کی طرف دوڑا آ رہا ہے اب کوے بہت نیچی پرواز کرنے لگے تھے۔ انہوں نے پنجے مار کر سینڈز کی قمیص اور پتلون پھاڑ دی تھی۔ کتا سمجھ گیا کہ یہ موذی پرندے اس آدمی کو مُردہ سمجھ کر اس کا گوشت کھانا چاہتے ہیں۔ اس نے آتے ہی ان پر حملہ کر دیا اور آدھے گھنٹے تک ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ کووں نے پنجے مار مار کر کتے کو بھی لہولہان کر دیا تھا مگر اس بہادر جانور نے میدان سے منہ نہ موڑا۔ اتنے میں ایک ہیلی کاپٹر وہاں سے گزرا۔ پائلٹ نے رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر دیکھا تو ہیلی کاپٹر نیچے اتار لیا اور فائر کر کے کووں کو بھگا دیا پھر اس نے سینڈز اور کتے کو ہیلی کاپٹر میں سوار کیا اور قریب ایک بستی میں لے گیا جہاں ان دونوں کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ سینڈز نے منہ مانگی رقم دے کر اس کتے کو اپنے لئے خرید لیا۔ وہ کتا گڈریئے کا تھا۔ بعد میں حکومت کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو حکومت نے اس کتے کو بہادری کا تمغہ دیا۔

●●●

سردی کا موسم

تنویر پھول، ایم اے

گرمی نے جب منہ کو چھپایا
سردی نے تب رنگ جمایا!

تھر تھر تھر تھر کانپ رہے ہیں
اپنے بدن کو ڈھانپ رہے ہیں

باندھو مفلر، پہنو موزے !
کھاؤ مونگ پھلی، چلغوزے!

پتے، مکھن اور بالائی !!
سردی عمدہ تحفے لائی !

کہتی ہیں منے کی دادی !
آئی سردی کی شہزادی !

پھول کا نغمہ مل کر گاؤ!
سردی کا تم لطف اٹھاؤ!

اقرأ

خالد بن محمود احمد

بہت سی چیزیں بہت عام ہیں۔ اسی لئے ان کو گننے اور شمار کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی لیکن کبھی کوئی شمار کرنے بیٹھے تو دانتوں پسینے آجائیں۔ ہندسے جواب دے جائیں اور عقل چکرا کر رہ جائے۔ مثلاً" آسمان پر تارے' مثلاً" وسعتِ صحرا میں ذرے' مثلاً" سمندر کی تند و تیز موجیں' خیر دیگر مثالوں کو چھوڑیں ہم سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں کہ یہی بات اللہ تعالیٰ کے احسانات کی ہے۔

وجودِ انسانی سے لے کر کائناتِ امکانی کے غیر معلوم گوشوں تک اس عظیم ہستی کے احسانات کی ایک ختم نہ ہونے والی فہرست ہے۔ اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ یہ احسانات سب کے لئے ہیں۔ اسے ماننے والے کے لئے بھی اور سرکش و متکبر کے لئے بھی! دیگر اہم ترین بات یہ ہے کہ احسان کرنے والا اتنا اعلیٰ ظرف ہے کہ سب کچھ دیتے ہوئے۔ مسلسل دیتے ہوئے بھی اس کی طرف سے جتانے یا طعنہ دینے کی بات سامنے نہیں آتی۔ ہاں جہاں کہیں اس کی حکمت اسے بہت ضروری خیال کرتی ہے یا وہ بات ہی اتنی اہم ہوتی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس کی اہمیت کو نمایاں اور روشن کردے۔ جیسے اپنے لافانی کلام کی تیسری سورت میں وہ فرماتا ہے کہ "درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں خود انہی میں سے ایک ایسا رسول معبوث فرمایا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے ان کا تزکیہ نفس فرماتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔"

یہ احسان' جسے احسانِ عظیم کہنا چاہئے کا جتانا ایک تو اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کی اہمیت کو نمایاں کرنا چاہا۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عالم الغیب کو معلوم تھا کہ سب سے زیادہ ناشکری اسی احسان کی ہوگی۔ مگر ان دونوں باتوں کے علاوہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس احسانِ عظیم کی شکل وہ بنے جنہیں خیرالبشر (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جاتا ہے۔ اب شخصیت اہم ترین ہے تو وہ کام کس درجے کے ہوں گے جو ان کے ہاتھوں انجام پائے۔ وہ کام اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں' تلاوتِ آیاتِ ربانی' تزکیہ' نفس اور تعلیمِ کتاب و حکمت ہیں۔ ان تین الگ الگ باتوں کی بنیاد میں' دیکھا جائے تو ایک ہی کام ہے جس پر تینوں عظیم کاموں کا دارومدار ہے یعنی تعلیم۔

اللہ اکبر کیا درجہ ہے معلم کا' تعلیم کا اور علم کا!!!

لذّت، فرحت، چاہت بھی ، رنگت، ٹھنڈک، خوشبو بھی
نورس
قومی مشروب
نورس
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-112، نورس روڈ، سائٹ، کراچی-75700 فون، 2563520 (5 لائنیں). فیکس، 92-21-2564570

REGD. No. SS-246 FEBRUARY 1997
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI